ایرانیوں کا مقصدی ڈراما

مسعود حسن

آنگی !

آنگی !!

آنگی !!!

مسافر آنگی پر جھک گیا۔ اُس نے آنگی کے سر کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔"

کیا بات ہے آنگی ؟"

آنگی اُٹھ بیٹھی۔ اُس نے آہستہ سے اپنے آپ کو مسافر کے بازوؤں سے علیحدہ کر لیا۔ اور مکی کے دانے الگ کرنے لگی۔

آخر اُس نے گھٹے ہوئے لہجہ میں کہا۔ "آہ مسافر مجھے یہاں سے لے چلو!" یہ کہکر اُس نے سر جھکا لیا۔ اور چپ چاپ رونے لگی۔

مسافر خاموشی سے مکی کے دانے الگ کرتا رہا۔ اُس نے آنگی کے آنسو نہیں پونچھے۔ اُس نے اُسے پیار نہیں کیا۔ یکایک ایک پرندہ اپنے سیاہ پر پھیلائے ہوئے تیر کی طرح سامنے سے نکل گیا۔ کھلیان کے اوپر دو تین ستارے چمک رہے تھے۔ آنگی کے آنسوؤں کی طرح اور کھلیان کے دوسری جانب عورتیں نئی دلہن کی سسرال کو روانگی کا گیت گا رہی تھیں۔ مسافر کی نگاہیں پہاڑوں سے پرے صنوبروں کے جنگلوں کو چیر کر وسیع میدانوں کو ڈھونڈنے لگیں۔ جہاں اُس کا دیس تھا۔ اُس کی نگاہوں میں ریل گاڑی کے پہیے اچھلنے لگے۔

مسافر خدا کا شکر بجا لاتا ہے۔ کہ وہ اپنی دُنیا میں واپس آگیا۔ اپنی تہذیب کی دُنیا میں،

کبھی خیال کرتا ہے۔ شاید میں نے غلطی کی۔ کبھی کبھی اپنے دوستوں کی محفل میں بیٹھے بیٹھے خوش فعلیاں کرتے ہوئے اُس کے کانوں میں عجیب

عجیب الفاظ گونجنے لگتے ہیں۔ راہی تم کتنے عجیب ہو، راہی۔ جیسے کہ اُس کے چہرے سے مسکراہٹ کافور ہو جاتی ہے اور وہ سوچتا ہے۔ کہ شاید کسی نیلے جھرنے پہ ریوڑ کو پانی پلاتے ہوئے ایک غریب لڑکی اُس کا انتظار کر رہی ہے۔ اُس کے پاؤں ننگے ہیں۔ اُس کی نگاہیں اداس ہیں۔ اُس کے خیالوں میں سیب کے پھولوں کا گچھا ہے ـــــ!

آنکلی!

صرف ایک آنہ

سروش کنگ جارج ڈاکس (KING GEORGE DOCKS) پہ گیا۔
وہاں اُسے ایک فورمین (FORE-MAN) مل گیا، فورمین نے ایک نیلے رنگ
کی قمیض اور پتلون پہن رکھی تھی۔ جس پر جابجا تیل کے دھبے نظر آرہے تھے۔
اور اُسکی چھوٹی سی ناک پہ ایک بہت بڑی عینک تھی۔ بہ حیثیت مجموعی وہ ایک
گندہ۔ بدنما اور معمولی انسان نظر آتا تھا۔ سروش کو اس کی آنکھوں میں نرمی و
ملائمت کی ایک خفیف سی جھلک دکھائی دی۔ پس اُس نے فورمین سے ملتے ہی
کہہ دیا۔ کہ وہ ایک بیکار ہے۔ اور کسی کام کی تلاش میں یہاں آیا ہے۔

تم کیا کر سکتے ہو۔ فورمین نے پوچھا۔

میں نے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی ہے۔ سروش نے جلدی سے جواب

دیا۔

"بے فائدہ۔ کیا تم بوجھ اُٹھا سکتے ہو؟ بھاری بوجھ؟"

"نہیں"

کیا تم کرین (CRANE) پہ کام کر سکتے ہو؟"

"نہیں تو —— مگر شاید کر سکوں۔ میرا باپ انجینیر تھا —— اور

پھر میں کئی دنوں سے بھوکا ہوں؟

فورمین ہنس پڑا۔ "تم مجھے اچھے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ کاش میں تمہاری
مدد کر سکتا۔ مگر ہم یہاں تعلیم یافتہ۔ میرا مطلب ہے ہم یہاں ڈگری یافتہ لوگوں
کو ملازمت نہیں دیتے۔ وہ عام طور پہ کمزور ہوتے ہیں، جسمانی کمزوری اور کام
کرنے کی صلاحیت بھی اُن میں کم ہی ہوتی ہے۔

اور پھر تم تو فن سے بے بہرہ ہو مجھے بہت افسوس ہے۔ اگر تم ہوڑہ پل پر چلے جاؤ۔ تو شاید کام بن جائے۔ میں نے سنا ہے، وہاں تعلیم یافتہ لوگوں کو ملازمت ملتی ہے۔"

"کہاں؟" سروش نے پوچھا۔

"ہوڑہ پل پر!—— کیا تم نے سنا نہیں۔"

سروش ہوڑہ پل پر گیا۔

ایک چھوٹے سے لکڑی کے تختوں سے بنے ہوئے کیبن میں جس کی کھڑکیوں میں سرخ اور سبز رنگ کے شیشے لگے ہوئے تھے۔ ایک یوریشین بیٹھا تھا سروش اس کے قریب بڑھا۔ اور درخواست سوال دراز کیا۔ "تم جانتے ہو۔ تمہیں یہاں کیا کرنا پڑے گا۔ یوریشین نے اپنی ناک کے نتھنوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔" بہت مشکل کام ہے۔ اور غالباً تم اسے نہ کر سکو گے۔ اور شاید پسند بھی نہ کرو۔"

"کیا کام ہو گا" سروش نے پوچھا، مگر ٹھہرو —— مجھے نہ بتاؤ میں اسے کر لوں گا۔"

یوریشین نے مسکراتے ہوئے کہا، ہم تنخواہ معقول دیتے ہیں۔ ہاں تو — تین روپے روزانہ اور دن میں صرف دس گھنٹے کام —— وہ رک گیا اور کھڑکی سے باہر ہگلی کے گدلے پانیوں کی طرف دیکھنے لگا، پھر یک لخت وہ سروش کی جانب مڑا "کیا تم یوریشین ہو؟"

"نہیں"

"آہم! میرا بھی یہی خیال تھا۔"

"کیا تم ایک لوہے کی میخ کو لکڑی کے تختے میں سیدھا گزار سکتے ہو۔"

یورلشین نے پوچھا: "میں تم سے یہ سوال اس لئے کر رہا ہوں۔ کہ یہی کام تمہیں اُس پل پہ کرنا ہوگا۔ میخیں گاڑنا۔ دن بھر لکڑی کے تختوں میں میخیں گاڑتے چلے جانا، کیا تم اسے کر سکو گے؟"

"کر سکوں گا" سروش نے جواب میں کہا: میرا باپ انجینئر ——

"بس بس" یورلشین نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ مجھے تمہارے شجرہ نسب سے کوئی دلچسپی نہیں" یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لئے رُکا۔ پھر سروش کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ "ساٹھ روپے میں یہ کام ہو سکتا ہے" یہ کہہ کر اُس نے پھر ایک پُرمعنی انداز میں سروش کی جانب دیکھا۔

سروش نے کمزور لہجہ میں جواب دیا "لیکن میرے پاس تو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں"

یورلشین کو غصہ آگیا کہنے لگا: میں کہتا ہوں، کیا تم مجھے گاڈ دی تصور کرتے ہوئے۔ میرے پاس ملازمت کے لئے استدعا کرنے آئے ہو۔ کیا میں تمہارا چچا ہوں (میز پر مکہ مار کر) ہم یہاں صرف یورلشین لوگوں کو ملازمت دیتے ہیں۔ سمجھے، مگر میں شاید اس امر کی بھی پرواہ نہ کرتا، کیا ساٹھ روپے زیادہ ہیں۔ خود پھر تم تو اس کام سے بھی واقف نہیں ہو۔ کیا تم ایک لوہے کی میخ سیدھی طرح لکڑی کے تختوں میں سے گزار سکتے ہو؟ مجھے شبہ ہے۔ تم میں کئی تنی خامیاں ہیں۔ کیا تم نے کسی صنعتی درسگاہ میں تعلیم پائی ہے؟ —— لیکن میں اُسے بھی جانے دیتا ساٹھ روپوں کے لئے یہ رقم زیادہ نہیں اور جب تم نوکر ہو جاؤ گے اور تین روپے روزانہ مشاہرہ حاصل کرو گے۔ تو تم یقیناً میرے شکر گزار ہو گے نو لکالو روپے" یہ کہکر یورلشین نے اپنی تقریر ختم کی اور مربیانہ انداز

سے سروش کی طرف دیکھنے لگا۔

"لیکن ..... لیکن سروش نے کانپتے ہوئے لہجہ میں کہا" میرے پاس تو ایک کوڑی بھی نہیں، ایمان سے کہتا ہوں"

پورلشین نے جواب میں اپنے کندھوں کو ایک اضطراری حرکت دی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

سروش نے آہستہ سے کہا "میں تمہیں اپنی تنخواہ سے دو روپیہ یومیہ دینے کو تیار ہوں۔ اگر ——

پورلشین نے اپنے مخصوص اینگلو انڈین لہجہ میں کہا۔ سب فضول باتیں ہیں۔" اب وہ ہر ایک لفظ پہ زور دے کر فقروں کو ادا کر رہا تھا" ایک دفعہ ..... جس دن تمہارا نام رجسٹر میں درج ہو گیا۔ تم میرے اختیار سے باہر ہو گئے، سمجھے!"

سروش چند لمحوں کے لئے چپ رہا۔ وہ حیران تھا کہ کیا کہے۔ ساٹھ روپے کہاں سے لائے۔ کس سے مانگے۔ کون اُسے ادھار دے گا۔ اُس کے پاس تو کوئی ایسی چیز بھی نہ تھی جسے وہ گروی رکھ سکتا۔ وہ دو دن سے بھوکا تھا وہ پھر پورلشین سے ملتجی ہوا۔

"آپ مجھ پر یقین رکھیں" سروش نے نہایت لجاجت سے کہا" میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ..... "

مگر پورلشین نے اُسے فوراً روک دیا۔ کہنے لگا" چلو نکلو یہاں سے قسمیں کھاتے ہو۔ یہ کوئی گرجا گھر نہیں ہے"

جب سروش باہر نکلا تو مغرب میں آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ ایک دُخانی جہاز کی گھنٹی منحوس انداز میں چیخ چیخ کر جہاز وال مزدوروں کو بلا رہی تھی۔ ہگلی کا پانی

شعاعوں کے انعکاس سے سُرخ تھا۔ سروش کو احساس ہوا، جیسے کسی نے آسمان کے مغربی کونے میں سورج کو قتل کر دیا ہے اور اب اس کا لہو بہ کر ہنگلی میں آ رہا ہے۔ اُس نے ایسا محسوس کیا۔ کیونکہ فضا میں بھی موت کا سا سکون تھا۔ اور ایک گہرا تعفن، بدبو کاٹھری کے گیلے تختوں سے اُٹھ رہی تھی۔ یکایک پاس کے گھاٹ سے کوّوں کا ایک جھنڈ کرخت آواز میں کائیں کائیں کرتا ہوا مغرب کی جانب پرواز کر گیا۔ سروش نے ایک آہ بھری اور یونہی ایک سمت کو چل پڑا۔

سروش نے کوڑا کرکٹ اُٹھانے والی کارپوریشن کی لاری کو دیکھا۔ جو ایک بجلی کے کھمبے کے پاس کھڑی تھی۔ لاری چلانے والا قریب کی ایک دوکان سے پان خرید رہا تھا۔ یکایک ایک چھوٹا سا غریب بازاری کُتا کہیں سے آنکلا، سردی سے ٹھٹھرتا ہوا۔ دم دبائے ہوئے لاری کے قریب پہنچا، اور پہیّوں کو سونگھنے لگا۔ پھر آہستہ آہستہ پتلی سی آواز میں چلانے لگا۔ بچارا غریب کتا شاید کئی دن سے بھوکا تھا۔ اور اب میلے سے لدی ہوئی گاڑی سے ایمونیا کی بُو اُس کے نتھنوں میں گھُسی جا رہی تھی۔ اُس کے دماغ پر مسلّط ہو رہی تھی، اُس کی اشتہا کی حس کو اذیت پہنچا رہی تھی۔ بھُوک کے سروش نے محسوس کیا۔ کہ اگر اس وقت اِس کی نگاہوں کے سامنے بھُنی ہوئی مچھلی کی پلیٹ ہو تو اِس کی اشتہا انگیز بو بھی اِسی طرح اُس کے دماغ کو پریشان کر دے گی۔

کتّے کی چیخیں بلند ہوتی گئیں۔ وہ پہیوں کے گرد چکر کاٹ رہا تھا۔ بچارا لاری کے اوپر تو نہیں چڑھ سکتا تھا۔ شاید وہ عالم تصوّر میں عمدہ عمدہ پکوانوں کو دیکھ رہا تھا۔ چچوڑی ہوئی ہڈی، باسی ڈبل روٹی کے ریزے

اتنے میں ڈرائیور آ گیا۔ پانوں کا پلندہ سنبھالے ہوئے آتے ہی اُس نے کتے کی کمر میں زور سے ایک لات جمائی۔ ایک لمبی، بلند چیخ۔ جیسے کسی انسان کی ہوتی ہے۔ اگر اُسے ایک دو ہنٹر لگا دیئے جائیں۔ بیچارا کتا بھاگ نکلا۔ اس کی چھوٹی سی دم پچھلی لاتوں کے درمیان سے گذر کر پیٹ سے جا لگی تھی۔ کتا بھاگتا بھاگتا سڑک کی دوسری طرف چلا گیا جدھر سروش کھڑا تھا۔ وہ چاؤں چاؤں کر رہا تھا۔ سروش کو چپ چاپ کھڑے دیکھ کر اور اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے اپنی چیخیں کم کر دیں۔ پھر دو تین لمبی چیخوں کے بعد وہ چپ ہو گیا۔ اور سروش کے قریب کھڑا ہو کر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے دم ہلانے لگا۔

یہ جذبہ امید تھا کہ اظہار ہمدردی؟

کتا سروش کے قدموں کے گرد گھومنے لگا۔ جس طرح پہلے وہ لاری کے پہیوں کے گرد گھومتا تھا۔ لیکن اب وہ زیادہ پُر امید معلوم ہوتا تھا۔ وہ بار بار دُم ہلا رہا تھا۔ بار بار زمین سونگھ رہا تھا۔ پھر وہ یکایک کھڑا ہو گیا۔ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سروش کے چہرے پر جما دیں اور دُم ہلانے لگا۔

"ایک بسکٹ کھاؤ گے، بسکٹ؟"

یہ سروش کا آخری بسکٹ تھا۔ اُس نے اُسے جیب سے نکال لیا۔ کتنا خشک اور کرارا دکھائی دے رہا تھا۔ چھوٹے کُتے نے اُسے دیکھ لیا تھا۔ اور اب وہ چھوٹی چھوٹی چیخیں مارتا ہوا خوشی سے سروش کے گرد اچھل رہا تھا۔ اور زور زور سے دُم ہلا رہا تھا ...... آخر سروش کو وہ بسکٹ دینا ہی پڑا ...... کتے نے ایک لمحہ میں بس سے حلق کے نیچے اتار لیا۔ ایک لمحہ بھی زیادہ عرصہ ہوتا ہے۔ سروش شاید کتے کی آنکھوں میں آنسو بھی دیکھ رہا تھا۔ ایک بھوکا آدمی

تھا اور ایک بُڈھا کتا اور اب دونوں سڑک کے کنارے چپ چاپ مغموم کھڑے تھے۔ جیسے دُنیا سے باہر نکال دیئے گئے ہیں۔

ایک لمبے وقفہ کے بعد سروش نے سر جھکایا اور ایک طرف کو چل پڑا۔ کتا آہستہ آہستہ اُسے کے پیچھے آ رہا تھا۔

وہ رات اُس نے سیالدہ سٹیشن پر بسر کی۔ تھرڈ کلاس ویٹنگ روم کا پختہ فرش جس پر سیمنٹ لگا ہوا تھا سخت ٹھنڈا تھا۔ اُسے مشکل سے ویٹنگ روم کہا جا سکتا تھا۔

کیونکہ یہ ایک کمرہ تو نہ تھا۔ بلکہ محض ایک برآمدہ سا تھا۔ تین اطراف سے کھلا اور چھت پر ٹین کے پرانے تختے اور چھت کے نیچے کہیں کہیں لوہے کے کھمبے تاکہ چھت کو سہارا رہے۔ اور گرنے نہ پائے۔ سروش اِس برآمدے سے باہر سیاہ آسمان پر انگاروں کی طرح دمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھ سکتا تھا۔ اور وہاں ایک پیلا سا مٹیالی رنگت کا چاند بھی دکھائی دے رہا تھا۔ یہ چاند ایک پکے ہوئے ولایتی کیک کی مانند تھا۔ جو ابھی ابھی انگیٹھی سے باہر نکالا گیا ہو۔ سروش نے اُسے دیکھتے دیکھتے اپنی آنکھیں بند کر لیں، ہاں وہ تھکا ہوا تھا اور بھوکا تھا دن بھر وہ میلوں چلتا رہا۔ اور کلکتے کی گلیوں، اُس کے شاندار بازاروں اور پُر شکوہ چوکوں میں گھومتا رہا تھا۔ وہ ایک پاگل آدمی کی طرح چکر کاٹتا رہا۔ اُس دیوانے کی طرح جو محض اپنے پیٹ کے لئے دیوانہ ہو گیا ہو۔ لیکن اُسے نوکری کہیں نہ ملی۔ اُسے نوکری کیوں نہ ملتی تھی؟ کیوں لوگ اُس کے غربت زدہ چہرے کو دیکھ کر چڑ جاتے تھے۔ جیسے کسی چیز نے انہیں شرمندہ کر دیا ہو۔ لیکن کیوں؟...... مگر اب سروش کو اِن باتوں کی پرواہ نہ تھی۔ وہ آج بہت تھکا ہوا تھا۔ اُس کا دماغ کام کرنے سے رُک گیا تھا۔ وہ محسوس

کر رہا تھا۔ کہ شاید اُس کے دھڑ کے ساتھ ٹانگیں نہیں ہیں۔ بے حد تکان تھی جیسے شراب کا نشہ ہو۔ پھر اُسے ایسا معلوم ہوا، جیسے کوئی اندر داخل ہو کر اُس کے جسم کی ہڈیوں کو توڑ رہا ہے۔ اُس کے معدے کو مٹھی میں دبا کر زور سے بھینچ رہا ہے۔ اُس کے ماتھے پر تیز تیز سوئیاں چبھو رہا ہے آہ......

اُس نے اپنی ٹانگیں فرش پر پسار دیں اور بازو پھیلا دیئے۔ ہاں سمنٹ کا فرش خوب ٹھنڈا تھا۔ اُسے تھوڑا سا سکون حاصل ہونے لگا۔ تکان سے اینٹھے ہوئے اعضا آہستہ آہستہ ڈھیلے پڑنے لگے۔ اب اُسے اگر کہیں سے تھوڑی سی روٹی مل جاتی۔ بس ایک دو ٹکڑے بیوقوف، اُس نے اپنا بسکٹ کتے کو کیوں دے ڈالا۔ بیوقوف...... سروش آہستہ آہستہ اپنے ننگے بازوؤں کو فرش پر پھیلانے لگا۔ ہاں فرش خوب ٹھنڈا تھا۔ ٹھنڈا۔ صاف اور خشک۔ گلی یا سڑک کے فٹ پاتھ کی طرح نمدار اور گرد آلود نہیں تھا۔ مجھے آئندہ یہاں ہی سونا چاہیئے۔ اِس نے دل میں سوچا۔ یہ جگہ اِس وقت تو کافی ویران دکھائی دیتی ہے اور پھر یہاں کوئی پولیس کا سپاہی بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اور کسی بھلے مانس نے بجلی کا بلب بھی توڑ دیا ہے...... یکایک اِس کا ہاتھ کسی نرم و گرم شے سے ٹکرایا۔ یہ ایک ہاتھ تھا۔ یونہی بغیر شعوری طور پر ہی اِس نے اِس کی انگلیوں کو چھوا۔ پھر اس کی ہتھیلی کو ہاتھ لگائی۔ اِس کے بعد اِس کی انگلیاں ایک کانچ کی چوڑی پر جا کر رک گیئں۔ سروش نے آنکھیں کھولدیں۔ اُس کے نزدیک ایک کونے میں ایک عورت گھٹنے سمیٹے ہوئے بیٹی تھی۔ وہ اِس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔ وہ سو رہی تھی۔ اِس کا سیاہ بازو نرم اور گداز تھا۔ اُس کی دھیمی سانس باقاعدگی سے چل رہی تھی۔ یک لخت پلٹ کر وہ اِس کے پہلو کی طرف مڑ گیا۔

"تم کون ہو؟" عورت نے ایک مدھم مغموم لہجہ میں پوچھا۔ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے ایک مرتبہ سروش کی طرف دیکھا۔ پھر انہیں بند کر لیا۔ وہ ایک غریب بھیک مانگنے والی عورت تھی۔ وہ غریب تھی۔ اور بدصورت اور بے حد تھکی ہوئی......اُسے کس کی پرواہ ہو سکتی تھی......!

صبح کے دھندلکے میں پولیس کے ایک سپاہی نے ٹھوکر سے سروش کو جگا دیا اور دھکا دے کر ویٹنگ روم سے باہر نکال دیا۔ عورت سروش سے پہلے ہی کہیں جا چکی تھی۔ خدا جانے کدھر؟

دوسری مرتبہ اگر میں نے تمہیں یہاں سوتے ہوئے دیکھا!" پولیس کا سپاہی کہہ رہا تھا۔ تو میں تمہیں سیدھا جیل خانے پہنچا کر دم لوں گا۔ حرامزادہ کہیں کا۔ سور کا بچہ......نکل یہاں سے......" سروش آنکھیں ملتا ہوا ایک طرف کو چل پڑا۔ سپاہی کی گالیوں کا اُس پہ کچھ اثر نہ ہوا۔ کیسی اچھی رات تھی۔ اور ہاں اُس مہربان بھیک مانگنے والی عورت نے اُسے کتنا آرام دیا تھا۔ ایک میلے سے چیتھڑے میں جسے وہ اپنے سر کے نیچے دبائے ہوئے تھی۔ بہت سی عمدہ عمدہ چیزیں بندھی تھیں۔ چند کھجوریں، ایک ناریل اور ایک پوری روٹی......اب وہ کہاں تھی؟......کیا وہ اُسے پہچان سکے گا؟......مہربان بھکارن!......

یکایک کسی نے اُسے دھکا دیا۔ "کیا تمہاری آنکھیں......کیا......کیا تم اندھے ہو گئے ہو" ایک موٹا بابو کہہ رہا تھا......"راستہ دیکھ کر نہیں چلتے۔ سر پر چڑھے آتے ہو......حرامی بھک منگے......بدمعاش! اسی طرح گالیاں دیتا ہوا موٹا بابو آگے گزر گیا۔

لیکن شاید سروش نے اُسے نہیں سُنا ۔ وہ بہت دُور اپنی خیالوں کی دُنیا میں گم تھا ۔ اور ساری کائنات اُس کے گرد چکر کاٹ کر واپس بھاگ رہی تھی ۔ اُس نے سوچا ۔ کتنا ہی اچھا ہو اگر وہ ایک بھکارن بن جائے اِس میں بُرائی ہی کیا ہے اب تو یوں بھی اُسے لوگ بھک منگا سمجھتے ہیں ...... اور پھر بھک منگے انسانوں سے زیادہ رحمدل ہوتے ہیں ......

× × × × × × × ×

منگتو، بھکاریوں کا سردار لاتیں پھیلائے چٹائی پر حقہ پی رہا تھا ۔ اُس کی توند موٹی تھی ۔ اور داڑھی سفید اُس نے سروش کو کھلے گلے اور لمبے کالروں والی ململی قمیض دی اور نیلی سرج کا کوٹ جس پر تیل کے بڑے بڑے دھبے تھے اور ایک گرے فلالین کی پتلون اور ایک چمڑے کا بیگ " یہ لو بیٹا " منگتو نے کہا " ان کپڑوں کو پہن لو ، اور اِس بیگ کو ہاتھ میں تھامے رکھو ۔ دیکھو اِس بیگ میں کیا ہے ؟ " اُس نے بیگ کھولتے ہوئے کہا ۔ ایک پرانی قمیض ۔ ایک دانت صاف کرنے والا برش ایک پرانا استرہ ، زنگ آلودہ اور گھسے ہوئے صابن کی ڈبیہ بس یہی تمہارے ہتھیار ہیں ۔ یہی تمہاری دوکان ہے اِن سے اچھی طرح فائدہ حاصل کرو ۔ تم کہتے ہو کہ تم کلکتہ یونیورسٹی کے گریجویٹ ہو ۔ میں اِسی بات پر بغیر سرٹیفکیٹ دیکھے یقین کر لیتا ہوں ۔ ہمارے ٹولے میں کئی دسویں پاس بھکاری ہیں ۔ لیکن تم پہلے گریجویٹ بھکاری ہو ۔ جیسا میں نے شروع میں کہا ۔ مجھے تم پر اعتماد ہے ۔ تمہاری لیاقت پر ، تمہاری دانائی پر مجھے امید ہے ۔ کہ تم ہمارے پیشہ کے لئے باعثِ فخر ہو گے ۔ اب اِسی پیشہ کو پکڑ لو ۔ ہمیشہ کے لئے اور اپنی اُن تمام چالاکیوں کو کام میں لاؤ ۔ جو تم نے زمانہ تعلیم میں حاصل کی ہیں ۔ اگر تم ہوشیار رہے تو ایک دن میری جگہ حاصل کر لو گے ۔ لوگ کہتے ہیں کہ کلکتہ

انگریزی سلطنت میں جہاں آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا۔ وسعت اور آبادی کے لحاظ سے دوسرا شہر ہے۔ میں نہیں جانتا یہ سچ بھی ہے کہ نہیں۔ لیکن اگر ایسا ہو تو کالی ماتا تمہیں توفیق دیں۔ کہ تم اِس کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکو لو بٹیا"۔ منگتو نے اپنی تقریر ختم کی اور پھر چند وقفوں کے لئے رُک گیا۔ اور اِدھر اُدھر دیکھ کر اُس نے چٹائی کے قریب پڑے ہوئے بوٹوں کے ایک جوڑے کو اٹھا لیا۔ اور سروش کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔ "اور ہاں بٹیا میں تو انہیں بالکل ہی بھول گیا تھا۔ انہیں بھی پہن لو"۔

سروش چٹائی پر بیٹھ کر انہیں پہننے لگا۔ بہت پرانے بوٹ تھے سوکھا ہوا چمڑا۔ کرم خوردہ بے رنگ و بد زیب۔ یکایک سروش کی نگاہیں ایک سبز لیبل پر پڑیں۔ جو بوٹ کے اندر لگا ہوا تھا۔ سروش کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اُس کے کلیجے میں برچھی بھونک دی ہو۔ یہ اٹیو نیا مارکہ بوٹ تھا۔ وہی پرانا سبز لیبل۔ انہیں بوٹوں کو وہ ہمیشہ کالج کے دنوں میں جالنس اینڈ کو کی دکان سے خریدا کرتا تھا۔ شاید یہ قسمت کی وحشیانہ بیرحمی تھی۔ کوئی اُس کے دل کو مسوس رہا تھا۔ یکایک اُس کا گلا بند ہونے لگا۔ کوئی غیر مرئی طاقت اپنے آہنی ہاتھوں سے اُس کے گلے کو دبا رہی تھی۔ اُس نے محسوس کیا۔ کہ اگر وہ اِس وقت نہ بول سکا تو پھر شاید ہمیشہ کے لئے چپ ہو جائیگا۔ مر جائیگا۔ اُس نے بازوں سے ہوا میں کسی کو پکڑنے کی کوشش کی۔ اُس نے مُنہ کھول کر ہوا کے ایک دو گھونٹ نیچے اتارنے کی کوشش کی۔ اُس نے بولنا چاہا۔ اور پھر یکایک اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور ایک بلند وحشیانہ چیخ یا ہنسی اُس کے لبوں سے پھوٹ نکلی وہ جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کا بند بند ہنسی سے کانپ رہا تھا۔

"مت ہنسو" منگتو نے کانپتے ہوئے کہا۔ کالی ماتا کے لئے اِس طرح مت

ہنسو۔

سر دش چیختا گیا۔ یا شاید ہنستا گیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہتے گئے تیز و
تند آنسو۔ جو انگاروں کی طرح گرم تھے۔ جو اُس کے خشک، روکھے رخساروں
کو جن پر داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ سیراب کر رہے تھے۔ اور اس کی لمبے لمبے
کالروں والی مالگجی قمیض کو تر کر رہے تھے۔ یکا یک اِس نے چمڑے کے بیگ
کو ہاتھ میں تھام لیا۔ اور تیزی سے بھاگ گیا۔

اِس دن دوپہر کو چلچلاتی دھوپ میں چترنجن ایوی نیو کے پاس مان سنگھ
ٹیکسی ڈرائیور کو ایک پولیس سارجنٹ نے روک لیا۔ ایک حادثہ ہوگیا تھا۔ جس
میں ایک آدمی ایک تیزی سے بھاگتی ہوئی لاری سے ٹکرا کر زخمی ہوگیا تھا۔
مان سنگھ نے دیکھا۔ کہ سڑک کے درمیان لہو سے سُرخ جگہ پر ایک آدمی
بیہوش پڑا تھا۔ وہ ایک پرانا نیلا کوٹ پہنے تھا۔ اور اُس کے ہاتھوں کی
مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ پولیس سارجنٹ نے مان سنگھ کو مدد کے لئے کہا۔
مان سنگھ اور پولیس سارجنٹ دونوں نے مل کر اِس آدمی کو ٹیکسی میں لٹا دیا۔

جب مان سنگھ نے بیہوش آدمی کا جسم ایک لمبی سیٹ پر رکھا اور اِس کی
بھنچی ہوئی مٹھیوں کو ٹھیک کیا۔ تو اُس نے دیکھا۔ کہ دائیں ہاتھ کی گھٹی ہوئی
ہتھیلی میں کوئی چمکتی ہوئی چیز دبی پڑی ہے۔ اُس نے جُھک کر غور سے دیکھا
یہ ایک آنہ تھا!

لاہور سے بہرام گلہ تک

میں اور کلیم مشن کالج کی لائبریری میں بیٹھے چینی مصوری کے متعلق ایک کتاب دیکھ رہے تھے یا یوں کہئے کہ کتاب کی جاذب نظر تصاویر پر اچٹتی ہوئی نگاہیں ڈال رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ گفتگو آہستہ آہستہ ہو رہی تھی۔ پھر بھی لائبریری کے وسیع سناٹے میں شہد کی مکھیوں کے بھنبھنانے کی سی گونج پیدا ہو گئی تھی۔ گفتگو کا موضوع نہایت دلچسپ تھا۔ یہی سینما کی ایکٹرسیں۔ کچن کا تماشا۔ پنیر اور لقریب ساڑھیاں۔ پروفیسروں کی حماقتیں وغیرہ وغیرہ

یونہی اوراق اُلٹتے اُلٹتے لی بانگ کی مشہور و مقبول تصویر شفق سامنے آ گئی، وہی ٹیڑھے ترچھے نقوش، حقیقتائی آرٹ سے ملتے جلتے۔ مدھم رنگ جھیل کے پھیکے سے نیلے پانی میں مغربی پہاڑوں کی سبز سبز چوٹیاں اور اُن پر پھیلے ہوئے اُٹھے ہوئے، چمکتے ہوئے۔ نارنجی بادلوں کا انعکاس —— لی بانگ کی مصوری حقیقتاً بڑی مسحور کن ہے۔

کلیم نے اپنی لمبی بے چین، لرزتی انگلیاں، جو اس کے طبعی رجحان کو غیر شعوری طور پر واضح کر رہی تھیں آہستہ سے شفق پر رکھ دیں اور پھر میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"میں پرسوں شملہ جا رہا ہوں کاظمی کی کوٹھی خالی پڑی ہے! تم بھی چلو!"

میں نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ اس مرتبہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں لاہور سے کہیں باہر نہ جا سکوں گا"

کلیم نے پوچھا "وہ کیوں؟"

میں نے کہا "کیا کہوں، کچھ حالات ہی ایسے ہیں"

کلیم چپ ہو رہا اور لی بانگ کی "شفق" کو غور سے دیکھنے لگا۔ شاید اُسے اِس چینی شاہکار میں شملہ کے ابھرتے ہوئے نقوش نظر آ رہے تھے۔

مگر حالات بدلتے کیا دیر لگتی ہے؟ میں لائبریری سے اُٹھ کر گھر آیا۔ تو مکند نے (میرا نوکر ہے بیچارہ) جلدی سے ایک تار میرے حوالہ کیا، لفافہ چاک کر کے پڑھا۔ لکھا تھا:-

میرپور کشمیر

میری شادی بیس جون، جلدی پہنچو

"گور بخش"

اچھا تو یہ بات تھی۔ مدّت سے مجھے گور بخش کا کوئی خط نہ ملا تھا۔ اور میں حیران تھا۔ کہ اِس امر کو اِس کی سستی پر محمول کروں یا اُس کی بیوفائی پر، آج معلوم ہوا۔ کہ خط نہ لکھنے کے اور بھی بہت اسباب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً محبت، شادی موت اور علیٰ ہذا القیاس۔

گور بخش میرا جگری دوست ہے، مکتب کی شرارتوں میں ہم دونوں نے ہمیشہ اکٹھے حصّہ لیا۔ اور عموماً اکٹھے ہی پیٹے۔ دو معصوم دلوں کی رفاقت کے لئے اِس سے بڑھکر پختہ اور کونسی بنیاد ہو سکتی ہے۔ اور گو اب فکرِ معاش نے گور بخش کو مجھ سے جُدا کر کے لاہور سے دور کشمیر کے ایک غیر دلچسپ گوشے میں پھینک دیا ہے۔ پھر بھی یہ معاشی و جغرافی مجبوریاں ہماری دلی رفاقت پر اثر انداز نہیں ہو سکیں ——— وہ رفاقت جوں کی توں قائم ہے۔

گور بخش میرپور میں رُوسی پٹرول کی ایجنسی کا مالک ہے، کئی بار اُس نے میرپور

آنے کو لکھا ہے۔ لیکن ہر بار مختلف وجود سے میں میرپور نہیں جاسکا اور اب میں تار پا تھ میں لئے یہ سوچ رہا تھا۔ کہ مجھے گوربخش کی شادی پہ جانا چاہیئے یا نہیں، آخر گوربخش دوست ہے۔ اور دوست کی شادی یا موت پر زور نہیں ہوا کرتی، لیکن —— تصویر کا دوسرا پہلو شملہ ہے اور کاظمی کی کوٹھی بھی خالی ہے۔ شملہ اور میرپور میں وہی فرق ہے جو لی یانگ کی "شفق" اور رشن کالج کی لائبریری میں ہے۔ اور پھر یہ تو صاف ظاہر ہے۔ کہ اگر میں میرپور چلا جاؤں تو پرسوں شملہ نہیں جاسکتا۔ بالفاظ دیگر، اگر میں پرسوں شملہ چلا جاؤں تو گوربخش کی شادی دیکھنے سے رہ جاتا ہے۔ اور اگر کل میرپور چلا جاؤں تو کاظمی کی کوٹھی خالی پڑی رہ جاتی ہے۔

اِس شش و پنج کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے ناچار "جفت یا طاق" کے عملیہ کو کام میں لانا پڑا۔ ایک پیسہ چہرہ شاہی کو اونچا ہوا میں پھینک کر اور چہرہ شاہی کو شادی کا مبارک عنوان سمجھ کر میں خاموش ہو رہا۔ دوسرے لمحہ میں پیسہ زمین پر تھا۔ اور چہرہ شاہی میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

بہت اچھا۔ شملہ نہ سہی میرپور ہی سہی۔ تجھے ڈھونڈھ ہی لیں گے کہیں نہ کہیں رات کو ساڑھے نو بجے کی گاڑی پر سوار ہوا۔ اور دوسرے دن صبح میرپور پہنچ گیا۔

میرپور کا یہ چھوٹا سا شہر ریاست کشمیر کی عملداری میں ہے۔ لیکن اگر یہ کشمیر کے بجائے راجپوتانے کے ریگستان میں ہوتا۔ تو زیادہ موزوں رہتا وہی گرم خشک آب و ہوا تمازت آفتاب سے جلی ہوئی پہاڑیاں، پھیکے بے مزہ کنوئیں۔ یہ بھلا گوربخش کو کیا سوجھی۔ یہاں آکر پیٹرول کی ایجنسی تو لی ہی تھی۔ اب کیا ایک صحرائی دلہن ہی سے عمر بھر کا پیمان باندھا تھا۔

رات کو پہاڑی گیتوں اور ڈھولک کی پُرشور آواز کے درمیان جب میں نے گوربخش سے اچانک یہی سوال کیا تو اُس نے کچھ توقف کے بعد مسکرا کر کہا:
"یہ سب کمبخت دل کا قصور ہے۔ اِسے جو چاہو سزا دے لو۔"

"خوب، تو پھر یہ لومیرزح ہے کیا؟"

گوربخش مسکرا کر چپ ہو رہا۔

آنگن میں کسی لڑکی نے ایک نیا گیت شروع کیا تھا۔ اِس کا پہلا بند مجھے یاد ہے:۔

اِک بدلی آ ساون دی
کھڑک ڈیک دکھاں ماہیئے دے آون دی
سب پھیر دلاں دے تی ماٹے   مینوں دس کھاں نی ماٹے!

شادی کے بعد یہ صلاح ٹھہری کہ گوربخش کو ہنی مون (HONEY-MOON) منانے کا موقع ہر گز نہ دیا جائے۔ بلکہ چار پانچ دوستوں کی ٹولی میں اُسے بھی شامل کر کے خوب اِدھر اُدھر سیر کی جائے۔

جگدیش نے اپنی عینک صاف کرتے ہوئے کہا "کدھر کی سیر ہوگی؟"
اوتار سنگھ نے اپنے نیلے، نازک لبوں پر زبان پھیر کر کہا "ان جلی ہوئی پہاڑیوں میں کیا خاک دھرا ہے؟"

چاچو نے چمک کر کہا "میں بتاؤں۔ چلو سرینگر تک ہو آئیں۔ پیدل چلنا ہوگا۔ خوب لطف رہے گا۔

ایک لمحہ —— بس صرف ایک لمحہ کے لئے ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر ہم سب خوشی سے تالی بجا کر بول اُٹھے۔

"واہ۔ واہ۔ کیا اچھی تجویز ہے" "بھئی کیا خوب" "واللہ تمہیں کیا خوب سوجھی۔"

قربان علی نے گوربخش کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا" اب کیا ارادہ ہے تمہارا اس بارے میں؟"

گوربخش نے مری ہوئی آواز میں کہا" میں تمہارے ساتھ ہوں"

اس پر پھر ایک زبردست قہقہہ ہوا۔

میرپور سے چلے تو تیسرے دن کوٹلی آئے۔ کوٹلی پہنچکر میرپور کے جلے ہوئے سیاہ ٹیلے سرسبز پہاڑیوں میں مبدل ہو جاتے ہیں۔ ہوا میں ایک جاں بخش خنکی سی محسوس ہوتی ہے۔ اور پھیکے، بدذائقہ کنوؤں کے پانی کے بجائے قدرتی چشموں کا آب شیریں ملتا ہے۔ یہاں پہنچکر پچھلے سفر کی سب کلفتیں دور ہوگئیں۔

ایک دن آرام کرنے کے بعد کوٹلی سے چلکر سہرہ پہنچے جو کوٹلی سے کوئی پندرہ بیس میل کے فاصلے پر ہے۔ سہرہ سے ریاست پونچھ کی عملداری شروع ہوتی ہے۔ اس کا پہلا ثبوت جو ہمیں ملا وہ پونچھ کسٹمز ہاؤس تھا۔ جو سڑک کے کنارے کشمیر کسٹمز ——— سے ملتی تھا۔ چونکہ دونوں جگہ محصول ادا کرنا پڑتا تھا۔ لہٰذا ہم نے دونوں جگہ محصول ادا کرنے سے انکار کر دیا۔

کشمیری نژاد انسپکٹر کسٹمز نے نہایت شریفانہ لہجہ میں کہا" آپکے پاس چند اشیاء تو ضرور ایسی ہوں گی۔ جن پر ہمیں مجبوراً محصول لینا ہوگا۔

قربان علی نے ڈپٹ کر پوچھا" یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

پونچھ کے نوجوان و شکیلی محالدار نے منہ بناتے ہوئے ایک نرالے انداز میں کہا" تو صاحب آپ کے پاس قابلِ محصول کونسی اشیاء ہیں۔

قربان علی نے بھی اُسی طرح مُنہ بناتے ہوئے ایسے انداز میں کہا "اے ہے! میں قربان جاؤں" صاحب! ہمیں تو آپ کے سر کی قسم جو ہمارے پاس کوئی ایسی شے ہو۔ آپ کے سر کی قسم آپ کے حسن صبیح کی قسم، آپ کے......"

حسین محالدار نے ڈانٹ کر کہا: "چپ رہو جی۔"

اِس مزاح کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ہمارا سب سامان کھول کھول کر اچھی طرح دیکھا گیا۔ بستر، خیمہ چھولداری، برتنوں کی بوریاں ایک ایک چیز کو بغور دیکھا گیا۔ آخر کار بڑی کاوشِ تجسّس کے بعد محالدار صاحب کو ایک بستر میں لپٹا ہُوا ایک پورٹیبل گراموفون ملا۔ اُور ایک وائلن محالدار صاحب نے آخری چیز کو چھو کر پوچھا "یہ سارنگی ہے؟"

قربان علی نے نہایت شیریں لہجہ میں جواب دیا "نہیں دلربا!"

پوچھ کے محالدار صاحب نے غصّہ سے لال پیلے ہوتے ہوئے کہا "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، اگر آپ گالیاں دینے پر اُتر آتے ہیں تو مجھے بھی مجبوراً آپ کو پولیس کے حوالہ کرنا پڑے گا۔"

"میں کہتا ہوں" قربان نے تیز ہو کر کہا "یہ (وائلن کو ہاتھ لگا کر) دلربا ہے آپ نہیں۔ بخدا، آپ کو اپنی ذات سے کس قدر حُسنِ ظن ہے۔ یہ ساز ہے جسے آپ اپنی دانست میں سارنگی سمجھ بیٹھے ہیں۔ اِس کا نام "دلربا" ہے۔ سمجھے آپ؟ اب آپ شوق سے پولیس کو بلایئے۔ اُور میں کسی پاگل خانے کے ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔" یہ کہہ کر قربان اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ گویا کسی پاگل خانے کے ڈاکٹر کو ڈھونڈ رہا ہو۔ ہم سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

کسٹم آفیسر صاحب جھینپے تو سہی۔ مگر تھے آخر کسٹم کے افسر، جھٹ بات کا رُخ بدل کر

گراموفون کی طرف اشارہ کر کے بولے " اور صاحب ! یہ کیا ہے ؟
جگدیش نے گراموفون کو آگے بڑھا کر کہا " جناب یہ ٹائپ رائٹر نہیں ہے بلکہ
پورٹیبل گرافون ہے - کولمبیا کمپنی کا بنا ہوا ، اُس کے اندر ایک درجن ریکارڈ بھی
بند ہیں - اگر جان کی اماں پاؤں تو ابھی چند ریکارڈ آپ کے سامنے بجاؤں بعض
ریکارڈ تو بہت ہی دلکش ہیں - خاص کر مس دلاری کا وہ کیف آور گیت سے

رات دن جونگی میں بیٹھا رہتا ہے
اپنے پہلو میں دبائے دردِ دل

محالدار صاحب آخر انسان تھے ہنس پڑے اور ایک دفعہ جو ہنسے تو پھر خوب
کھل کر ہنسے ہمارے اور اُن کے قہقہوں نے پوچھ کسٹم ہاؤس کے کونے کونے
کو بہجت سے لبریز کر دیا - اب جونگی کا ہر فرد بشر شاداں و فرحاں نظر آ رہا تھا -
اور تو اور کشمیری انسپکٹر صاحب بھی اپنا کام چھوڑ ہمارے قہقہوں میں شریک
ہو گئے - اور اِس طرح سب غم و غصہ گرد و غبار کی طرح دلوں سے ڈھل گیا -
چنانچہ شام کو کشمیری انسپکٹر صاحب نے ہمیں چائے پلائی - وہ چائے جو صرف اہلِ کشمیر
ہی بنانا جانتے ہیں - اور رات کو ہم نے پوچھی محالدار صاحب اور کشمیری انسپکٹر
صاحب دونوں کو شریکِ طعام کیا - خاصی رات گئے تک گلچھرے اُڑاتے رہے"
دلربا بجی اور جگدیش نے "دردِ دل" کوئی چھ سات بار بجایا - خوب لطف رہا -
دوسرے دن ستھرہ سے جو چلے تو شام کو شہر پوچھ پہنچ گئے - ابھی ہم شہر
سے چار پانچ میل کے فاصلے پر تھے کہ ہمیں ریاست پوچھ کا یہ چھوٹا سا خوبصورت
پہ تخت خوشنما باغات سے گھرا ہوا نظر آیا ، سامنے سر سبز اور اونچے پہاڑوں سے گھری
ہوئی ایک حسین وادی تھی - جس کے بیچوں بیچ دریائے پوچھ کا نیلا پانی پتھروں پر
شور مچاتا ہوا گزر رہا تھا - دور تک دھان کے وسیع کھیت پانی سے لبالب

بھرے ہوئے نظر آرہے تھے۔ مرغابیوں کے خوشنما پر ہوا کے دوش پر پھیلے ہوئے تھے اور غروب آفتاب کی ارغوانی کرنوں میں پوچھ کا تاریخی قلعہ ایک اونچے ٹیلے پر شہر کی باقی سب عمارات سے اوپر اٹھا ہوا، ایک ترشے ترشائے ہیرے کی طرح چمک رہا تھا۔

میں نے آہستہ سے کہا۔ "نہایت حسین منظر ہے۔"

اونار سنگھ کے نازک لب کانپے جس طرح پھول کی پتیاں ہوا میں کانپتی ہیں۔ مگر وہ کچھ نہ بول سکا۔ ہم چلتے چلتے "صم بکم" ہو کر کھڑے ہو گئے۔ قدرت کے غیر فانی مصوّر نے اپنی آرٹ گیلری کی بے پناہ دستوں میں سے ایک تصویر ہمارے سامنے پیش کر دی تھی۔ جس نے ہمیں مسحور کر دیا۔

کتنی ہی دیر اسی طرح کھڑے رہنے کے بعد ہم وہاں سے چلے، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے منظر کو دیکھتے ہوئے اور اپنے دلوں میں انسان کی کم مائیگی و بیچارگی کا احساس لئے ہوئے رفتہ رفتہ سڑک اب ڈھلوان ہوتی جارہی تھی اور نیچے اترتی ہوئی۔ بل کھاتی ہوئی وادی کی طرف چلی گئی تھی۔ آہستہ آہستہ ہم ایک نالے کے قریب پہنچے، جس پر نیلے پتھروں کا ایک چھوٹا سا پل بنا ہوا تھا۔ پل کے پار چنار کے دو درخت کھڑے تھے۔ اب شہر بالکل نزدیک آ گیا تھا ——— چھوٹا سا خوبصورت شہر جو سامنے بہتے ہوئے ندیا کے باہر واقع تھا۔ شفق کی ارغوانی روشنی رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں گم ہو گئی تھی اور شہر کی کھلی ہوئی کھڑکیوں اور درختوں کی پھیلی ہوئی ٹہنیوں میں بجلی کے قمقمے ٹمٹماتے ہوئے ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔

آہستہ آہستہ ہم دریا پر آپہنچے، دو شکستہ برجوں کے درمیان دو آہنی رسوں کے سہارے ایک لکڑی کا پل لٹک رہا تھا۔ جو ہمارے قدم پڑتے ہی

ڈولنے لگا۔ جب ہم پل کے درمیان پہنچے تو یہ حالت تھی۔ کہ پل کسی ڈوبتی ہوئی کشتی کی طرح ڈانواں ڈول ہو رہا تھا۔ اور ہم بدمست شرابیوں کی طرح لڑکھڑا رہے تھے۔ ہچکولوں پر ہچکولے آ رہے تھے اور شاید نیچے بہتے ہوئے دریا کی پُرشور لہریں اُبھر اُبھر کر پیاری پیاری لوریاں سُنا رہی تھیں۔ گوربخش کو جو ترنگ آئی تو پل کے درمیان کھڑا ہو کر گانے لگا۔ وہی سہگل کا دلکش گیت۔

جھولنا جھلاؤ ری ۔ جھولنا جھلاؤ

امبوا کی ڈالی پہ کوئل بولے ۔ کوئل بولے

کوک کوک۔ جیا آوے ۔ جھولنا جھلاؤ ری

رات کا وقت، وہ جانفروز نغمہ، دریا کی مضطرب لہریں، پل کا جھولنا۔ اس وقت کی یاد مدتوں ہمارے دل میں رہے گی۔

شہر پونچھ کی آبادی تقریباً دس ہزار نفوس پر مشتمل ہے یہ ریاست کا صدر مقام ہے۔ اس کا اصلی نام "پرنتس" تھا۔ راجہ پرنتس کے نام پر رکھا گیا۔ لبعدمیں بگڑ کر پونچھ رہ گیا۔ اور اب اسی نام سے مشہور ہے تاریخی حیثیت سے بھی وادی پونچھ کافی اہمیت رکھتی ہے۔ ہیون سانگ مشہور چینی سیاح کے سفرنامہ میں بھی اس کا تذکرہ ہے ہیون سانگ نے خاص کر وادی سوہرن کے مضبوط قلعوں کی بہت تعریف کی ہے۔ یہ وادی شہر پونچھ سے دس میل کے فاصلے پر ہے لیکن اب ان قلعوں کا نام و نشان بھی مشکل سے ملتا ہے۔ صرف کہیں کہیں چند کھنڈر باقی ہیں۔ جو اپنی گذشتہ عظمت کی یاد میں سرنگوں ہیں۔ مغلوں کے عہد میں شاہانِ مغلیہ، خصوصاً جہانگیر بادشاہ اسی راستہ سے کشمیر جایا کرتے تھے۔ مابعد سکھوں کے عروج کے وقت بھی یہ خطہ کافی مشہور رہا۔ چنانچہ سکھوں کے کئی

بزرگ بھائی میلا سنگھ، روچا سنگھ، بندہ بیراگی اسی خاک کی پیداوار ہیں۔

شہر پونچھ کا قلعہ قابلِ دید عمارت ہے۔ یہ مغلوں اور راجپوتوں کے زمانے کی یادگار ہے۔ یہ شہر کے جنوب مغرب میں دریا کے قریب ایک اونچی جگہ پر بنا ہوا ہے۔ قلعہ کا عقبی منظر بہت شاندار ہے۔ لیکن اس کا شرقی حصّہ جو حال ہی میں گرا کر دوبارہ تعمیر کیا گیا ہے، چنداں دیدہ زیب نہیں اور اس کی ظاہری ٹیپ ٹاپ باقی حصوں کی کہنگی و پختگی کے مقابلہ میں ایک نہایت بھونڈا مذاق پیش کرتی ہے۔

قلعہ کے قریب ہی فوارہ باغ ہے۔ جو نشاط باغ سرینگر کا ایک ہلکا سا نفیس چربہ ہے۔ اس باغ کی ڈیوڑھی ایک اونچی محراب دار عمارت ہے۔ جس پر جابجا ہندو دیوتیوں اور دیوتاؤں کے رنگین بت بنے ہیں۔ ڈیوڑھی کے اندر داخل ہوتے ہی فوارہ باغ کی وسیع درمیانی روش نظر آتی ہے۔ جس پر بجری بچھی ہے، اور جس کے دو رویہ بلند و بالا سرو کے درخت کھڑے ہیں یہ روش باغ کو ٹھیک دو حصوں میں تقسیم کرتی ہوئی زنانہ پارک کی طرف جاتی ہے۔ جو باغ کی زیریں منزل میں جنوب کی طرف واقع ہے۔ بالائی منزل میں ٹینس کورٹ اور حکام اعلیٰ کا کلب ہے۔ یہ باغ بہت وسیع و پُر فضا ہے۔ شام کو لوگ باگ اکثر سیر کرنے کے لئے یہاں آتے ہیں۔ اور آڑو، ناشپاتی وغیرہ کے درختوں کے نیچے گھاس کے سبز مخملیں بچھونوں پر سگندراج اور گلاب کی جھکی ہوئی عطر بیز ٹہنیوں کے قریب، پانی اچھالتے ہوئے فواروں کے پاس بیٹھ کر قدرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ رانی صاحبہ اٹیلیا کا خوشنما قصر اور موجودہ والیٔ ریاست کا موتی محل بھی قابلِ دید عمارات ہیں۔ موتی محل مغربی طرزِ تعمیر کا مظہر ہے۔ یہ انگریزی دیہاتی طرز پر بنا ہوا ہے اور نارمن اور گاتھک طرزِ تعمیر کا حسین امتزاج ہے۔

پونچھ میں ہم تین روز رہے اور خوب سیر کی۔ یہ صاف ستھرا بانکا شہر ہے۔ گلیاں عموماً پکی ہیں اور گندے پانی کے نکاس کا بھی اچھا انتظام ہے۔ ہم یہ صفائی دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

چاچو نے خواہش ظاہر کی "کاش سری نگر بھی ایسا ہی صاف ستھرا شہر بن جائے۔"

اوتار سنگھ نے کہا "تمہاری خواہش بالکل فضول ہے اور نہ صرف فضول اور نکمی ہی ہے۔ بلکہ اِس سے نقص امن کا بھی اندیشہ ہے اور ایک عالمگیر جنگ چھڑ جانے کا احتمال ہے۔"

چاچو بےچارہ حیران ہو گیا۔ کہنے لگا "وہ کیسے؟"

اوتار سنگھ نے جواب دیا "نہایت سیدھی بات ہے۔ اگر خدانخواستہ سری نگر صاف ستھرا شہر بن جائے تو پھر بھلا سوئٹزرلینڈ کون جائے۔ اور اگر سوئٹزرلینڈ کوئی نہ جائے۔ تو پھر سوئٹزرلینڈ کہاں سے کھائے اور سری نگر کے مقبول عام ہونے پر کیوں نہ ہندوستان و سوئٹزرلینڈ میں جنگ چھڑ جائے ٹھیک ہے؟ کیا تم نے مغربی اقوام کی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا ہے؟"

جگدیش نے مسکراتے ہوئے کہا "کیا واہیات ہے؟ اور پھر بفرضِ محال اگر یہ سب کچھ سچ بھی ہو تو پھر بھی جنگ کا چھڑنا ناممکن ہے۔ کیا تم نے آج کا اخبار نہیں پڑھا؟"

گوربخش نے اچانک چلا کر کہا "اخبار؟ اخبار؟ ارے آج کا اخبار کدھر ہے؟ میں نے آج صبح ہی اُس میں ایک منحوس خبر پڑھی ہے۔"

قربان علی نے جماہی لے کر پوچھا "کیا ہوا؟ کیا مسولینی نے خودکشی کر لی؟"

گوربخش نے جلدی سے کہا "نہیں یہ بات نہیں ہے۔ تم کتنے گدھے ہو!"

سُکھ چین نے نہایت سنجیدہ لہجہ میں کہا "تمہارے سمیت سات !"
ہم سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔
گور بخش غصہ سے لال پیلا ہو کر بولا "اب تم ہنستے ہو، لیکن ذرا آج کا اخبار تو اچھی طرح دیکھ لو۔ سری نگر میں ہیضہ پھیل گیا ہے! سنا تم نے؟ اب خوب ہنسو! ہی ہی ہی!"
ہم سب نے چلا کر کہا "ارے ہیضہ!"
جگدیش نے خیمہ کے ایک کونے سے اخبار اٹھایا، ریاست جموں و کشمیر کا کالم پڑھا گیا۔ واقعی سری نگر میں وبائی ہیضہ پھیل گیا تھا۔ سیاح واپس جا رہے تھے۔
گور بخش نے تجویز پیش کی۔ میرے خیال میں اب سری نگر جانے کا خیال دل سے نکال دینا چاہیے۔"
قربان نے کانپ کر قرار داد کی اِن الفاظ میں تائید کی "بالکل درست۔ بیچارا گور بخش ابھی ابھی "کنوارے" سے "بیاہا" بنا ہے اِس کی امیدوں کا خون نہ کیا جائے"
سکھ چین نے زور دار الفاظ میں کہا "اور میں ہیضہ کی موت نہیں مرنا چاہتا یہ کچھ خلافِ تہذیب سی موت ہے"
چاچو نے تجویز پیش کی "تو بہتر یہ ہوگا۔ کہ اگر ہم سری نگر نہیں جا سکتے تو دریا بہرام گلہ تک ہی ہو آئیں۔ کافی ٹھنڈی جگہ ہے۔ سطح بحر سے کوئی نو ہزار فٹ بلند اور مشہور تاریخی مقام ہے۔ کیوں؟" یہ کہہ کر چاچو ہم سب کی طرف فاتحانہ انداز سے دیکھنے لگا۔ گویا کہہ رہا تھا۔ دیکھا ایسی نادر تجویز سوائے میرے اور کسی کے دماغ میں نہ آ سکتی تھی!
سب نے اِس معقول تجویز پر صاد کیا اور ہم دوسرے روز بہرام گلہ کو روانہ ہو گئے۔

اُس دن میلے کچیلے بادل آسمان پر چھائے ہوئے تھے۔ ہم نے احتیاطاً دو اچھے مضبوط مزدور اپنے ہمراہ لے لئے تاکہ راستہ میں آنیوالے طوفانی نالوں کو عبور کرنے میں مدد دے سکیں، ابھی ہم کوئی دو کوس ہی گئے ہوں گے کہ بونداباندی شروع ہو گئی۔ زور کا جھکڑ چلنے لگا۔ مطلع تاریک ہو گیا۔ اور پھر چند لمحوں میں کالی کالی گھٹاؤں نے بے طرح برسنا شروع کر دیا۔ راستہ میں جگہ جگہ پھسلن تھی۔ اور جگدیش کی پشاوری چپل جس کی وہ تمام راستے میں تعریفیں کرتا آیا تھا۔ اب یہاں اُسے بار بار دھوکا دے جاتی تھی اور وہ بیچارا اکثر جگہ دھڑام سے گر پڑتا تھا پہلی بار جب وہ گرا۔ تو ہم سب نے لمبا سا مُنہ بنا کر اس حادثہ پر افسوس ظاہر کیا۔ لیکن جب" رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج "۔ اب جبکہ جگدیش بار بار گرنے لگا تو یہ افسوس جلد ہی قہقہوں میں بدل گیا۔ اور اب یہ حالت تھی۔ کہ ہر دو فرلانگ چل لینے کے بعد ہم جگدیش کے گرنے کے منتظر رہتے اور کوئی تنگ سی پگڈنڈی سبز سبز دھان کے کھیتوں میں سے گزرتی ہوئی نظر آجاتی تو ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہتا۔ کیونکہ ہم جانتے تھے۔ کہ جگدیش کی پشاوری چپل جس کی وہ راستے بھر میں تعریفیں کرتا آیا تھا۔ یہاں اُسے اِن پانی سے بھرے ہوئے دھان کے کھیتوں میں ضرور اوندھا گرائے گی۔ اور پھر کبھی ایسا ہوتا کہ جگدیش گرتے گرتے چاچو، موہن لال، اوتار قربان یا اور جو کوئی بھی اُس کے آگے یا پیچھے چل رہا ہوتا اُس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرتا اور اِس طرح اُسے بھی اپنے ہی ساتھ پانی میں دھکیل لے جاتا۔ غرضیکہ اِسی طرح کیچڑ میں لت پت، بارش میں بھیگتے ہوئے گیلے میکنٹاش اوڑھے ہوئے، گرتے ہوئے گراتے ہوئے تین روز سفر کرتے رہے، راستے دشوار گزار تھے، تنگ اور ٹیڑھی پگڈنڈیاں، دشوار گزار گھاٹیاں، طوفانی نالے، کئی جگہ تو راستہ ملتا ہی نہ تھا۔ اور پھر طرّہ یہ کہ بلاکی موسلا دھار بارش

تھی اور آسمان کسی غریب کی ٹوٹی ہوئی چھت کی طرح ٹپک رہا تھا۔ اِن تین دنوں میں ہم نے بھاگلہ، سونمرگ۔ یقیناً زبین جگہوں پر مقام کیا۔ لیکن اف کس بلا کی سردی تھی۔ بجلی کی چمک، بادل کی گرج، برفانی ہواؤں کے فراٹے، دریائے پونچھ کی پُرشور روانیاں اور گیلے بستر، ایسا معلوم ہوتا کہ یہ جولائی کا مہینہ نہیں بلکہ دسمبر کا یخ لبستہ موسم ہے۔

خدا خدا کر کے چوتھے دن آفتاب نے بادلوں سے مُنہ نکالا اور دُھند میں لپٹے ہوئے سربفلک پہاڑ اور سرسبز مرغزار ایک نئی شان سے پھر جلوہ افروز ہوئے۔ اوتار سنگھ کے نیلے ہونٹوں پر سُرخی دوڑنے لگی اور گوربخش کے خاموش گلے سے سریلی تانیں نکلنا شروع ہوئیں۔ اِسی دن کی حسین شام کو جبکہ آفتاب مارٹھ کی برفانی چوٹی پر غروب ہو رہا تھا۔ اور جنگل کے وحشی آنکھوں والے نڈر گڈریے ریوڑوں کو واپس گاؤں کی طرف لا رہے تھے۔ ہم مغلوں کے پرانے عشرت کدہ بہرام گلہ میں داخل ہوئے۔

"گلہ" پہاڑی زبان میں ایک "تنگ راستہ" کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ بہرام گلہ چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ اِس کے جنوب مشرق میں ایک پہاڑ کو کاٹ کر دہ راستہ بنایا گیا تھا۔ جس راستہ سے شاہانِ مغلیہ کشمیر جایا کرتے تھے اِس کو بہرامی نام انجینئر نے تعمیر کیا تھا۔ اور اب یہ اسی انجینئر کے نام پر بہرام گلہ کہلاتا ہے۔ اِس راستہ کا اب محض نشان ہی موجود ہے۔ مغلوں کے زمانے کی شاہراہ اب ایک پگڈنڈی رہ گئی ہے۔ جس پر اب کبھی کبھی بھینیں چرتے ہوئے گوالے یا کوئی اکا دُکا مسافر نظر آ جاتا ہے۔ جس پہاڑ کو کاٹ کر یہ راستہ بنایا گیا تھا۔ اُس کے دامن میں ایک طوفانی نالہ بہتا ہے۔ جس کا نیلا یخ کی طرح ٹھنڈا پانی کاغان سے آتا ہے، کبھی اِس کاغان کے نالے پر ایک مستحکم پل تھا۔ آج اُس

کی جگہ چند لکڑی کے ناتراشیدہ کندوں نے لی ہے۔ جو پہلی برساتی بارش میں بہہ جاتے ہیں۔

بہرام گلہ ایک تنگ گھٹی ہوئی جگہ پر واقع ہے جو کاغان اور چندی مرڑھ کے نالوں کے درمیان ایک اونچی تلیٹی پر واقع ہے۔ اس کے شمال مشرق میں چندی مرڑھ کی جانب سلسلہ کوہ بہت اونچا ہوگیا ہے اور متواتر برف و باراں سے بے رلیش و بے رونق ہے۔ سنگلاخ زمین اونچی چٹانیں، قومی ہیکل دیووں کی طرح سر اٹھائے ہوئے ہیں۔ جن پر انسان کا قدم رکھنا ہر لحظہ اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا ہے۔ اور پھر یہاں سانپوں کی وہ بہتات ہے۔ کہ توبہ ہی بھلی سینکڑوں ہزاروں سانپ، ہر چٹان کے نیچے سانپ، ہر چٹان کے اوپر سانپ دھوپ سینکتے ہوئے، بل کھاتے ہوئے، پھنکارتے ہوئے، ایک عجیب ہیبتناک نظارہ ہوتا ہے۔ بس یہاں ان ننگے، بے زبان، سنگلاخ پہاڑوں پر صرف تین جاندار پائے جاتے ہیں۔ ایک تو ہی اشرف المخلوقات انسان ہے۔ جو موسم گرما میں یہاں کبھی کبھی نظر آجاتا ہے، بندوق اٹھائے ہوئے گھٹنوں تک چرمی موزے پہنے ہوئے شکار کی تلاش میں سرگرداں، دوسرا جاندار یہی سانپ ہے۔ جو اس اشرف المخلوقات کا ازلی دشمن ہے اور تیسرا جاندار ایک چوپایہ ہے اسکا نام "مارخور" ہے کیونکہ یہ سانپ کھاتا ہے۔ مارخور ایک نایاب جانور ہے اور یہ چوپایہ ہمیشہ ان سرد، بے زبان، دشوار گذار چٹانوں پر اپنا بسیرا کرتا ہے۔ یہ نہایت مضبوط جفاکش پھرتیلا جانور ہے۔ اس کے سر کی ہڈی اور سینگ نہایت مضبوط ہوتے ہیں اور اکثر اسے سر کے بل سو فٹ تک چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔

مارخور کا شکار نہایت جان جوکھوں کا کام ہے آج سے صدیوں پہلے ایک ایسے ہی شکار کو دیکھتے ہوئے ایک مغل بادشاہ کی جان گئی تھی۔ اس دن مارخور

کا شکار ہو رہا تھا - اور دوپہر کے بعد چٹانوں کے بڑھتے ہوئے سایوں میں جہانگیر
بادشاہ، دلی کا لااُبالی شہزادہ سلیم نہیں بلکہ بوڑھا جہانگیر ایک چٹان پر بیٹھا ہوا
مارخوروں کا شکار دیکھ رہا تھا، سامنے ایک شکاری بہت دیر سے ایک
مارخور کے تعاقب میں تھا - کبھی چٹانوں کے اوپر ہزار دقت قدم رکھتا ہوا -
کبھی چٹانوں کی اوٹ میں چھپتا ہوا - سانپوں سے ڈرتا ہوا پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا
لیکن نہایت ہوشیاری سے، چالاکی سے، پھرتی سے وہ ہر لحظہ اپنے شکار کے
قریب آ رہا تھا - اور کسی دلچسپی سے انہماک و شوق سے جہانگیر گردن بڑھائے
ہوئے لب کھولے ہوئے اِس انتظار میں تھا - کہ کب شکاری شکار پر جھپٹتا ہے
کہ اتنے میں دفعتہً شکاری ایک اونچی چٹان سے پھسلا، اِس کے دونوں ہاتھ
بے اختیار اوپر اُٹھ گئے - فاتحانہ نگاہوں میں موت کی تاریکی دوڑ گئی مُنہ
سے ایک دلخراش چیخ نکلی - اور دوسرے لمحہ شکاری چار سو فٹ نیچے ایک
چٹان پر گرا اور گرتے ہی پاش پاش ہو گیا -

جہانگیر کے دل پر ایک ناقابل برداشت چوٹ لگی اُسے ایسا معلوم ہوا
کہ اِس کا دل دھمک کر مُنہ میں آ گیا - جہانگیر نے ہاتھ کے اشارے سے کھیل
کو بند کرنے کا حکم دیا - رات کو اِسی صدمہ سے اُسے بخار ہو گیا، شاہی حکما
نے بہتیرا علاج کیا - لیکن موت کا علاج اُن کے پاس نہ تھا - چنانچہ پانچ چھ
روز بخار میں مبتلا رہنے کے بعد مغلیہ خاندان کا یہ روشن ستارہ ٹوٹ کر فضائے
بسیط میں گم ہو گیا - وہ لاؤ لشکر وہ گہما گہمی، وہ نواب امیر زادے، عربی گھوڑے
خواجہ سرا حسین کنیزیں، راجپوت جرنیل، کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی صرف
ملکہ نورجہاں اور تین چار معتبر افراد اِس حادثہ سے باخبر تھے - مشہور کر دیا
گیا کہ بادشاہ کی طبیعت بدستور ناساز ہے - اسی حالت میں زیرک ملکہ

لبوں پہ مسکراہٹ مگر دل میں خون کے آنسو روتی ہوئی لاہور پہنچی ۔ آگے جو
کچھ ہوا وہ سب دُنیا جانتی ہے ۔

بہرام گلہ میں ہم سات روز رہے ۔ لیکن کبھی بھول کر بھی چندی گڑھ کے
خونیں پہاڑ پر نہ گئے ۔ ہاں ہم چندی گڑھ کے چھوٹے سے قصبہ میں پرانی
مغلیہ سرائے دیکھنے ضرور گئے ۔ وہ کسی زمانے میں نہایت شاندار سرائے ہوگی
لیکن جب ہم نے اُسے دیکھا ۔ تو بالکل خستہ حالت میں تھی ۔ جن کمروں میں کبھی
نواب اور راجے مہاراجے آکر اُترا کرتے تھے ۔ وہاں آج چوہے دوڑ رہے
تھے اور زمانے کے انقلاب پر زبانِ حال سے "زندہ باد" کے نعرے بلند کر رہے
تھے ۔ اکثر کمروں پر پہاڑی لوگوں نے قبضہ جما رکھا تھا ۔ اور گھر بنا کر رہتے تھے ۔
چنانچہ جن اصطبلوں میں کبھی عربی گھوڑے ہنہناتے تھے ۔ وہاں آج بھینسیں ڈکار
رہی تھیں اور چھتوں اور منڈیروں پر اُگی ہوئی گھاس نہایت موثر لہجہ میں
آثارِ قدیمہ کو دعوتِ عمل دے رہی تھی ۔

یہاں کے لوگ نہایت غریب ، شکیل اور جفاکش ہیں ۔ صرف موسم گرما میں
یہاں رہتے ہیں ۔ اور اپنی زمینوں میں کاشت کرتے ہیں ۔ یہاں سال بھر میں صرف
ایک فصل ہوتی ہے ۔ موسم سرما میں یہ لوگ بال بچوں سمیت نیچے گرم علاقوں میں اتر
جاتے ہیں ۔ اور مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں ۔ تاریخ کا اثر دیکھئے ۔ صدیاں
گذر جانے کے بعد بھی اِن لوگوں میں "نورجہاں" اور "جہانگیر" نام رکھنے والوں
کی کثرت ہے ۔ ہر گھر میں کم از کم ایک "نورجہاں" اور ایک جہانگیر ضرور موجود
ہے ۔ یا مرکب ناموں میں اِن دو ہستیوں کا نام آجاتا ہے ۔ مثلاً نورجہاں
فاطمہ ۔ جہانگیر شیر علی خاں ۔ اور ایسے کئی عجیب عجیب نام سننے میں آتے ہیں ۔
بالعموم ہر گاؤں کے نمبردار کو "جہانگیر" کہا جاتا ہے اور ہر حسین عورت کو نورجہاں

کے نام سے پکاری جاتی ہے۔

چندی مڑھ کی سرائے دیکھ کر واپس آتے ہوئے ہمارے پہاڑی رہبر نے پہلا راستہ چھوڑ دیا۔ یعنی جس راستے سے ہم سرائے دیکھنے گئے تھے اور ایک دوسرا راستہ اختیار کیا جو ایک تنگ سی پگڈنڈی کی صورت میں ڈھلوان ہو کر آخر چندی مڑھ کے نالے میں ختم ہو جاتا تھا۔ راستے میں میں نے رہبر سے سوال کیا۔

"تم اب ہمیں کدھر لے جا رہے ہو؟"

"کچھ دکھانے کے لئے!"

"وہ کیا؟ کوئی شکستہ مزار یا فرسودہ قلعہ؟"

اوتار سنگھ نے ناک چڑھا کر کہا "تمہاری مراد شاید کسی عورت سے ہے۔ اگر ایسا ہو تو (کانوں پر ہاتھ رکھ کر) میں باز آیا"

قربان ہنس کر کہنے لگا "اوتار! تمہیں کیوں نہ جنسی منافرت پھیلانے کے جرم میں کالے پانی بھیج دیا جائے۔

اوتار سنگھ بولا "تو کیا کالے پانی میں عورتیں نہیں ہیں، بخدا اگر ایسا ہو تو میں آج گونگ مار ترک کرنے کو تیار ہوں"

ہمارا رہبر کہنے لگا۔ صاحبو۔ آپ کو کالے پانی جانے کی ضرورت نہیں جو چیز میں اب آپکو دکھلانے والا ہوں وہ حقیقت میں خود بھی نہایت خوبصورت ہے اور ایک خوبصورت عورت سے وابستہ ہے"

اس پر ہم سب چپ ہو گئے۔

اب ہم نالے میں چل رہے تھے۔ کبھی پانی میں سے گزرتے ہوئے کبھی پتھروں کو پھاندتے ہوئے نالے کے دونوں طرف نہایت دلاویز ہریاولی

تھی جو آنکھوں کو نہایت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ رنگ برنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ جن کی مہک سے ساری ہوا معطر تھی۔ سنبلو اور رس بھری کی جھاڑیاں پھلوں سے لدی پھندی تھیں۔ چلتے چلتے ہم کسی پھلدار جھاڑی کے پاس ٹھیر جاتے اور جھکی ہوئی شاخوں سے پکے ہوئے سنبلو اور سرخ سرخ رس بھریاں توڑ توڑ کر کھاتے، کہیں شمشاد کے نازک بوٹے کھڑے تھے، تو کہیں اخروٹ کے قد آور درخت لانبے لانبے ڈال پھیلائے ہوئے سایہ کر رہے تھے۔ اور ان پر جنگلی پرند بیٹھے تھے، جنگلی طوطے، گگڑ، ارنا گلے اور سنہرے جن کے پر تیتریوں کی طرح رنگین تھے۔ اور جن کی بولیاں بلبل کے نغموں کی طرح دلفریب تھیں، کبھی کوئی پرندہ پر پھیلائے کوکو کرتا۔ قوس قزح کی طرح چمکتا ہوا سامنے سے گذر جاتا اور آنکھوں کو روشن کر جاتا۔ کبھی کوئی صدیوں کے پرانے شاہ بلوط کا گھنا چھتنارا سامنے آجاتا۔ جس کے خوشگوار سائے میں نوجوان چرواہنیں اور چرواہے ریوڑوں کو ساتھ لئے ہوئے گاتے ہوئے، الغوزے بجاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

اسی طرح چلتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے، ایک دوسرے کو چھیڑتے ہوئے، ہم ایک پل کے قریب پہنچے جو نالے کو عبور کرنے کے لئے دو دیودار کے درختوں کو گرا کر بنایا گیا۔ یہ پل ایک تنگ موڑ پر تھا۔ جس سے آگے آنیوالی جگہ ہم سے پوشیدہ ہو گئی تھی۔

ہمارے رہبر نے کہا "یہی وہ جگہ ہے۔ ذرا کان لگا کر سنئے!"

ایک مدھم سا شور جیسے ہزاروں آدمیوں کے مجمع سے پیدا ہوتا ہے سنائی دیا۔ ہم اشتیاق میں جلدی سے آگے بڑھے اور تیز تیز قدموں سے موڑ کاٹ کر پل عبور کیا۔

سبحان اللہ!

کتنا خوبصورت آبشار تھا۔ کوئی چار سو فٹ اونچا پہاڑ کی چوٹی پر سے دو چٹانوں کو چیر کر نکلتا تھا۔ اور پھر کوئی دو سو فٹ نیچے اتر کر ایک اٹھی ہوئی چٹان کے پیچھے گم ہو جاتا تھا۔ اور پھر اسی چٹان کے قدموں سے لاکھوں بھنور بناتا ہوا نکلتا اور پتھروں پر سر پٹختا ہوا شور مچاتا ہوا ایک نالے کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ آبشار کے دونوں طرف جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی چٹانوں پر کہیں کہیں اونچے قد آور درخت کھڑے تھے۔ اور پانی کے چھوٹے چھوٹے لاکھوں موتیوں سے مزین تھے۔

میں نے آہستہ سے پوچھا۔ اِس کا کیا نام ہے؟"

"نوری چشمہ!" رہبر نے جواب دیا (THE FOLL OF LIGHT)

نوری چشمہ ——— !

نورِ جہاں!

(THE LIGHT OF THE WORLD)

یہاں ہوا بھی جان بخش خنکی تھی۔ اور ایک عجیب سی خوشبو، کچھ کچھ اوزون (OZONE) سے ملتی جلتی ہوئی۔ اور گو ہم آبشار سے ڈیڑھ دو سو گز کے فاصلے پر تھے۔ پھر بھی آبشار کی ہلکی ہلکی پھوار ہم پر پڑ رہی تھی۔ پانی کی چھوٹی چھوٹی بوندیں لاکھوں، کروڑوں، اِن گنت شبنم کے حسین قطروں کی طرح درختوں کے پتوں پر، جھاڑیوں کی جھکی ہوئی شاخوں پر بنفشہ کے شرمائے ہوئے پھولوں پر پڑ رہی تھیں۔ آبشار کے قریب ہی جہاں یہ نیچے چٹان میں غائب ہو رہا تھا، ایک خوشگوار ہلکا سا دھواں اُٹھ رہا تھا۔ اور اُس کے بیچ میں ایک دلکش قوس قزح تنی تھی مدھم اور رنگین۔ یہ قوس قزح ہر لمحہ ٹوٹ جاتی اور ہر لحظہ ٹوٹ کر نئی بن جاتی تھی۔

پہاڑ کی چوٹی پر سے لاکھوں ٹن پانی نیچے گر رہا تھا۔ رفتار میں نہایت تیز اور نہایت ہی آہستہ ایک لمحہ میں پانی بجلی کی سی سرعت کے ساتھ نیچے جاتا ہوا معلوم ہوتا۔ اور دوسرے لمحہ میں ایسا دکھائی دیتا کہ آبشار بالکل ساکن بن کر رہ گیا ہے اور گویا آبشار نہیں، محض برف کا ایک مہیب تودہ ہے۔ ایک گلیشیر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہے لیکن پھر فوراً ہی یہ احساس بھی زائل ہو جاتا اور گرتے ہوئے پانی کے کروڑوں بلبلے روئی کے گالوں کی طرح سفید آبشار کی رعد کی سی آواز اور اُڑتی ہوئی اور اس سے بھری ہوئی پھوار جلد ہی پہلے احساس کو برقرار کر دیتی۔

رہبر آہستہ آہستہ گویا کسی بھولے ہوئے قصہ کو دہرا رہا ہو کہنے لگا۔ وہ جو سامنے بڑھی ہوئی چٹان آپ دیکھ رہے ہیں۔ وہ چٹان بالکل آبشار کے نزدیک، یہ چٹان جہانگیر بادشاہ کے وقت میں بہت آگے بڑھی ہوئی تھی۔ اور اس چٹان پر پتھر کی دو کرسیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان پر جہانگیر بادشاہ اور ملکہ نورجہاں دوپہر کے بعد بیٹھا کرتے تھے۔ ادھر اُدھر پہاڑیوں پر قناتیں لگا دی جاتی تھیں۔ اس آبشار کے قدموں میں کنیزوں کے تیرنے کے لئے ایک تالاب بنایا گیا تھا جہاں ـــــ!

پتہ نہیں رہبر کیا کہہ رہا تھا۔ لیکن میری آنکھوں سے صدیوں کا پردہ ہٹ گیا تھا۔ میں اپنے سامنے ان دو کرسیوں پر بیٹھے ہوئے جوڑے کو دیکھ رہا تھا۔ ایک تھا جہانگیر بادشاہ، شہزادہ سلیم، انارکلی کا عاشق اور دوسری ہندوستان کی ملکہ نورجہاں، مرزا غیاث کی بیٹی، شیر افگن کی بیوی اور اب مغل بادشاہ کی چہیتی منکوحہ قناتوں کے اندر آنے جانے والوں کے لئے سزائے موت تھی، لیکن میں تو جہانگیر بادشاہ کے قریب کھڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک جام ارغوانی ہاتھ میں لئے ملکہ کے قریب جھک کر کیا کہہ رہا تھا؟ اور ملکہ اُسے کیا جواب دے رہی تھی؟ کیا اس جانفزا پھوار کے قطرے اُس ارغوانی جام میں ٹپک رہے تھے۔ اور کیا ملکہ

کی بل کھاتی ہوئی زلفیں اُسی پھوار کے موتیوں سے گندھی ہوئی تھیں؟"

مگر نہیں ـــــ یہ تو محض ایک وہم تھا۔ سراب حقیقت۔ یکایک اُس ارغوانی جام نے چھلک کر آبشار کی صورت اختیار کر لی۔ مغل بادشاہ اور حسین ملکہ کی تصویریں میری نگاہوں کے سامنے سے ہٹ گئیں۔ شاید ہوا کا وہی جھونکا انہیں واپس اڑا کر لے گیا۔ جس نے آج ایک دم کے لئے آج سے ساڑھے تین سو سال پہلے کی تاریخ کے فرسودہ رنگین اوراق اُلٹ دیئے تھے۔ اب پھر آنکھوں کے سامنے وہی آبشار تھا۔ خوبصورت ہیبتناک وحشی دل پر ایک عجیب احساس طاری ہو گیا قدرت کی جمالی کیفیتوں کے آگے انسانی حُسن کس قدر ہیچ ہے اور اُس کے پُر ہیبت شکوہ وجلال کے سامنے انسانی طاقت کس قدر پست نظر آتی ہے پانی کے ان لاکھوں کروڑوں ٹوٹتے ہوئے بلبلوں میں بشریت کی مکمل تاریخ موجود تھی۔ اور قدرت کی ابدیت کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کی کم مائیگی اور بیچارگی کا بھی اعتراف تھا۔ غالباً آج سے ہزاروں برس پہلے بھی یہی آبشار ہو گا۔ بالکل اسی طرح حسین اسی طرح دلفریب۔ انسانی صدیاں اس کے چند لمحات ہیں اور انسانی مسرتوں اور غموں کے مقابلہ میں اس کے پاس اپنی ابدی وحشیانہ ہنسی ہے!

پتہ نہیں۔ میں کتنی دیر وہاں بیٹھا رہا، پتہ نہیں میں کتنی دیر اور وہاں بیٹھا رہتا۔ اگر ایک مدھم اور نحیف آواز مجھے اس روحانی خواب سے جگا نہ دیتی، جب میں ہوش میں آیا۔ تو چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور آبشار کا پانی ایک نورانی سیل بن کر گر رہا تھا میرے سامنے ایک بوڑھی عورت کھڑی تھی۔ دوہری کمر، چہرے پر لاتعداد جھریاں، روئی کی طرح سفید بال اور نحیف آواز میں کہہ رہی تھی۔ "بابا، ایک پیسہ، خدا کا واسطہ، ایک پیسہ"

میں جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میرے ساتھی پرے

ایک ٹیلے پر بیٹھے بیٹھے چپ چاپ اور اکڑوں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کسی مافوق الفطرت سحر سے مسحور ہو گئے ہیں۔ سارا منظر افسانوی اور الف لیلوی تھا۔ ایسا گمان ہوتا تھا۔ کہ ہم انسانوں کی سرزمین میں نہیں ہیں۔ بلکہ کسی جنوں یا پریوں کی دُنیا میں آ گئے ہیں۔ لیکن اُس بوڑھی عورت کی کمزور آواز نے پھر چونکا دیا۔

"بابا ایک پیسہ خدا کے واسطے ایک پیسہ"

میں نے جلدی سے جیب سے ایک پیسہ نکال کر اُسے دیا۔ وہ مجھے دعائیں دینے لگی۔

میں نے آبشار کی طرف دیکھتے ہوئے اُس سے پوچھا: "تم اُسے جانتی ہو؟"

اس نے آہستہ سے پُراسرار طریق سے سر کو ایک اثباتی جنبش دی۔

"اس کا کیا نام ہے؟ تم جانتی ہو؟"

اس نے رک رُک کر کہا۔ "نوری..... چھنم..... نو.....ری.....چھنم"

شاید وہ کوئی بھولا بسرا واقعہ یاد کر رہی تھی۔

معاً مجھے کچھ یاد آ گیا۔ میں نے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"نور جہاں!"

یہ کہہ کر اُس نے آہستہ سے سر جھکا لیا۔ اور لکڑی ٹیکتی ہوئی آگے چل پڑی۔ چاندنی میں اس کے پریشان بال چاندی کے تاروں کی طرح چمک رہے تھے۔

مامتا

کوئی دو بجے کا وقت تھا، بادلوں کا ایک ہلکا سا غلاف چاند کو چھپائے ہوئے تھا۔ یکایک میری آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ساتھ کی چارپائی پر اماں سسکیاں لے رہی ہیں

"کیوں امی؟ میں نے گھبرا کر آنکھیں ملتے ملتے پوچھا۔

"کیوں ۔۔۔ امی! اماں نے سسکیوں اور ہچکیوں کے درمیان میرے سوال کو غصہ سے دہراتے ہوئے کہا" شرم نہیں آتی، باپ کو بھی اور بیٹے کو بھی۔ اتنے بڑے ہو گئے ہو۔ کچھ خدا کا خوف نہیں۔

" آخر ہوا کیا؟ میں نے جلدی سے بات کاٹ کر پوچھا" یہ آدھی رات کیوقت رونا کیسا؟"

گرمیوں کے دن تھے۔ ہم سب برآمدے میں سو رہے تھے۔ مگر ابا اندر سامنے ایک کمرے میں سو رہے تھے۔ اِن کی طبیعت ناساز تھی۔ اور انہیں اکثر گرمیوں میں بھی سردی لگ جانے کا اندیشہ لاحق رہتا ہے۔ اِس لئے عموماً وہ اندر ہی سویا کرتے ہیں۔ آخر اُن کی آنکھ بھی کھل گئی۔ وہیں بستر پر سے کروٹ بدل کر بولے" کیا بات ہے وحید؟ تمہاری اماں کیوں رو رہی ہیں؟"

میں کیا بتاؤں ابا بس رو رہی ہیں؟"

" ہاں اور تمہیں کس بات کی فکر ہے؟ اماں کی ہچکیاں اور بھی تیز ہو گئیں؟"

پتہ نہیں میرا لال اِس وقت کس حالت میں ہے۔ میرا چھوٹا محمود اور تم یہاں پڑے آرام سے سو رہے ہو۔ وہاں اِس کا کون ہے۔ نہ ماں، نہ بھائی دہی اور تم یہاں خراٹے لے رہے ہو۔ آرام سے جیسے تمہیں کسی بات کی فکر ہی نہیں

(سسکتے ہوئے) میں نے ابھی ابھی اپنے چھوٹے محمود کو خواب میں دیکھا ہے وہ ایک میلے کچیلے بستر میں پڑا بخار سے تپ رہا تھا۔ اُس کا پنڈا تنور کی طرح گرم تھا۔ وہ کراہتے ہوئے اماں اماں کہہ رہا تھا —— یہ کہہ کر اماں زور سے رونے لگیں۔

اماں کا "چھوٹا محمود" اور میرا بڑا بھائی لاہور بی، اے میں تعلیم پاتا تھا تھرڈ ایر بی، ایس ایف، اے کا سالانہ امتحان دیکر لاہور سے یہاں مئی کے مہینے ہی میں آگیا تھا۔ مگر محمود کو ابھی لاہور کی تپتی ہوئی فضاؤں میں پورا ایک ماہ اور گزارنا تھا۔ لیکن اب جون کا مہینہ بھی گزر گیا تھا۔ اور محمود ابھی تک لاہور سے واپس نہ آیا تھا۔ اماں بہت پریشان تھیں۔ اور سچ پوچھئے تو ہم سب بہت پریشان تھے۔ ہم نے اُسے پرسوں ایک تار بھی دے دیا تھا۔ اور مدتوں کے بعد اچانک کل ہی محمود کا خط آیا تھا۔ چند منحنی سطور تھیں۔ لکھا تھا۔ میں بیمار ہوں۔ ملیریا کا بخار ہے۔ لیکن اب ٹوٹ رہا ہے۔ چند دنوں سے یہاں بہت بارش ہو رہی ہے اگر لاہور کا یہ حال ہے تو اسلام آباد میں کیا ہوگا۔ کیا کشمیر آنے کا راستہ کھلا ہے جلدی لکھئے۔ کہ کس راستے سے آؤں۔ کیا جموں یا نہال روڈ سے آؤں —— کہ کوہالہ اوڑی سڑک سے، کونسا راستہ بہتر رہے گا؟ ہم نے سوچ بچار کے بعد ایک اور تار دے دیا تھا۔ گو بارش بہت ہو رہی تھی۔ اور دونوں سڑکیں شکستہ حالت میں تھیں۔ پھر بھی کوہالہ اوڑی روڈ، بانہال روڈ سے بہتر حالت میں تھی۔ اِس لئے یہی مناسب سمجھا۔ کہ محمود کوہالہ روڈ ہی سے آئے اب آدھی رات کے وقت یہ اُفتاد آپڑی۔

ابا کی نیند پریشان ہوگئی تھی۔ چیں بجبیں ہوتے ہوئے بولے۔" تو اُس کا کیا کیا جائے؟ اور تمہیں تو یونہی دل میں وسوسے سے اُٹھا کرتے ہیں۔ بھلا اِس

کا علاج کیا ہے؟ آخر محمود کوئی بچہ تو نہیں! تمہیں فکر کس بات کی ہے۔ ہزاروں ماؤں کے لال لاہور پڑھتے ہیں اور ہوسٹلوں میں رہتے ہیں۔ آنا ہی ہوگا اگر آج صبح وہ لاہور سے چلا۔ تو شام کو وہ راولپنڈی پہنچ گیا ہوگا۔ کل کو ہمارے اور ــــــــ

اماں جلدی سے بولیں" اور ...... اور؟ ...... کیا غضب کرتے ہو اور اگر خدا نہ کرے اُس کا بخار ابھی نہ ٹوٹا ہو تو پھر؟ میں پوچھتی ہوں تو پھر؟" یہ کہہ کر اماں رُک گئیں اور دوپٹہ سے آنسو پونچھ کر کہنے لگیں۔ مجھے موٹر منگوا دو۔ میں ابھی لاہور جاؤں گی۔

اب تم سے کون بحث کرے ہمیں تو نیند آتی ہے"۔ یہ کہہ کر ابا کروٹ بدل کر سو رہے۔ میں نے بھی یہی مناسب جانا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ مگر کانوں میں اماں کی مدھم سسکیوں کی آواز۔ جسے وہ دبانے کی بہت کوشش کر رہی تھیں، برابر آرہی تھی۔ کیا دل ہے ماں کا اور کتنی عجیب ہستی ہے اس کی؟ میں آنکھیں بند کئے ہوئے سوچنے لگا۔ ماں کا دل، ماں کی محبت، ممتا۔ کس قدر عجیب جذبہ ہے۔ عالم جذبات میں اُس کی نظیر ملنی محال ہے۔ نہیں یہ تو اپنی نظیر آپ ہے۔ ایک سپنے کے دھندلکے میں اپنے بیمار بیٹے کو دیکھتی ہے اور چونک پڑتی ہے۔ لرز جاتی ہے ممتا...... کیا اِس جذبے کی اساس محض جسمانی ہے۔ محض اس لئے کہ بیٹا ماں کے گوشت و پوست کا ایک ٹکڑا ہے؟ اور کیا ہم سچ مچ فلابیر کے تخیل کے مطابق اِس کائنات میں اکیلے ہیں، تنہا بے یارو مددگار ایک دوسرے کو سمجھتے ہوئے بھی ناآشنا، مگر میں بھی تو محمود کا بھائی ہوں، میری رگوں میں بھی وہی خون موجزن ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اور اپنی زندگی کے ان بیس سالوں میں صرف دو دفعہ محمود سے جدا ہوا ہوں اور وہ

بھی نہایت قلیل عرصوں کیلئے۔ پھر میں کیوں اس قدر اُس کے لئے بیتاب و بیقرار

ہیں۔ ماننا...... کیا ہم سچ مچ پتھروں کے تودے کی طرح ہیں۔ مصر کے مینار دں

کی طرح خوبصورت لیکن بیجاں اشوک کے کتبوں کی طرح سبق آموز لیکن بیحس

بے روح؟ ماننا!... بدھ نے کہا تھا کہ یہ دنیا دھوکا ہے سراب ہے، مایا ہے

ہوگی۔ لیکن یقین نہیں پڑتا۔ آخر یہ حسین جذبہ کہاں سے آیا؟ اور کائنات کے

ایک گوشے میں سسکتی ہوئی ماں کیا یہ بھی ایک دھوکا ہے؟ سچ جانئے یقین

نہیں پڑتا۔

چھوٹا محمود...... میرا ننھا محمود...... میرا لال

امی ہلکی ہلکی ہچکیوں میں بھائی کا نام لے رہی تھیں۔ کتنی معمولی سی بات تھی۔

بھائی جان شاید ابھی لاہور ہی میں ہونگے۔ ضیافتیں اڑاتے ہوں گے میڈیا دیکھتے

ہوں گے یا اگر لاہور سے چلے آئے ہوں تو راولپنڈی اِس وقت خوابِ خرگوش

میں پڑے خراٹے لے رہے ہوں گے۔ ملیریا کیا عجب ملیریا کا بخار مطلق ہی نہ

ہو۔ میں بھائی جان کے بہانوں کو خوب جانتا ہوں، اماں بھی جانتی ہیں مگر پھر

بھی رو رہی ہیں۔ آخر کیوں؟ ماننا!...... شاید یہ کوئی روحانی قرابت ہے،

شاید اس دنیا کے وسیع صحرا میں ہم اکیلے نہیں ہیں۔ شاید ہم محض پتھروں کے

تودوں کی طرح نہیں ہیں۔ شاید اِس انسانی مٹی میں کسی ازلی آگ کے شعلوں کی

تڑپ ہے معاً مجھے موپاساں کا افسانہ "تن تنہا" یاد آگیا۔ جس میں اس نے اس

شدید احساس تنہائی کا رونا رویا ہے۔ آہ بیچارہ موپاساں وہ ایک ماہر نفسیات

تھا اور ایک ماہر نفسیات کی طرح وہ کئی بار نفسیاتی واردات کا صحیح انداز کرنے

سے قاصر رہا۔ اُسکے افکار نے اُسے اکثر غلط راستہ پر ڈال دیا۔ "تن تنہا"

ایک ایسی ہی مثال ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

"عورت ایک سراب ہے اور حسن ایک فروعی امر، ہم ایک دوسرے کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے، میاں بیوی سالہا سال ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بیگانہ ہیں..... دو دوست ملتے ہیں اور ہر دوسری ملاقات۔ ایک دوسرے سے دور چلے جاتے ہیں.... نسوانی محبت مستقل دھوکا ہے..... اور جب میں عورت کو دیکھتا ہوں۔ تو مجھے چاروں طرف موت ہی موت نظر آتی ہے۔

میں نے آنکھیں کھول کر ماں کی طرف دیکھا۔ امی روتے روتے سو گئی تھیں، گال آنسوؤں سے گیلے تھے۔ اور بند آنکھوں کی پلکوں پر آنسو چمک رہے تھے۔ کیا امی موت ہے؟ اور کیا ممتا بھی کوئی ایسا ہی ہلاکت آفرین جذبہ ہے؟ شاید موپاساں غلطی پر تھا۔ شاید اُسے یہ لکھتے وقت اپنی شفیق ماں کی یاد نہ آئی تھی۔ وہ اِس کی جان بخش لوریاں، وہ نرم نرم تھپکیاں جبکہ وہ بچوں کی طرح صرف "اوں، اوں" کہہ کر بلبلا اٹھتا تھا۔ اور اُس کی چھاتی سے لپٹ جاتا تھا..... نسوانی محبت مستقل دھوکا ہے..... شاید اُسے اپنی اماں کے وہ طویل بوسے بھول گئے۔ کہ جب بڑا ہونے پر بھی اِس کا نفسیاتی سر اپنے بازوؤں میں لے لیتی تھی اور پیار کرتی تھی۔ جب وہ ممتا سے بیقرار ہو جاتی تھی۔ اور اس کی غیر حاضری میں بھی اُس کی راہ دیکھا کرتی تھی۔ اُس کی ہر غلطی کو بچوں کی بھول سے تعبیر کیا کرتی تھی۔ اور ہر گناہ کو نیکی میں مبدّل کر دیتی تھی۔ اِس دُنیا میں ہم اکیلے نہیں ہیں۔ بلکہ ہمارے ساتھ ہماری مائیں ہیں۔ وہ اِس شدید احساس تنہائی جس کی موپاساں کو شکایت ہے۔ جو دنیوی کلفتوں اور الفتوں میں بھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتا بجانے وہ ماں کی گود میں آکر کیسے ناپید ہو جاتا ہے ماں کے جذبہ محبت میں ایک ایسی دیوانگی و وارفتگی ہے۔ جو اِس کی انانیت کو فنا کر

دیتی ہے اور اِس کی ذات کو بچوں میں منتقل کر دیتی ہے۔

یقیناً ہم اِس دُنیا میں اکیلے نہیں ہیں۔ بلکہ ہمارے ساتھ ہماری مائیں ہیں....

.... یقیناً.... مگر......

غٹرغوں، غٹرغوں، گگڑوں کوں، گگڑوں کوں، کتو برا مرغ، چڑیاں، دوشیزہ سحر کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ اُن کی خوش الحانی نے مجھے بیدار کر دیا میں اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ ٹانگیں چارپائی سے نیچے لٹکا دیں۔ اور آنکھیں ملنے لگا اتنے میں آنگن سے اماں کی آواز آئی۔

"بیٹا وحید اُٹھو، محمود آ گئے۔"

آنکھیں کھول کر دیکھا تو سچ مچ..... اماں آنگن میں اُگے ہوئے پنجبارے کے بوٹے کے نیچے ایک موڑھے پر بیٹھی تھیں، اور محمود اُن کے پیروں پر جھکا ہوا تھا۔ میں جلدی سے اُٹھا آنگن میں ہم دونوں بھائی بغلگیر ہوئے۔

اتنے دن کہاں رہے؟" میں نے محمود سے پوچھا۔

محمود نے شوخ نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور ایک آنکھ میچ لی۔ پھر گردن موڑ کر پنجبارے کے سُرخ پھولوں کے گچھوں کو غور سے دیکھنے لگا۔

"کوئی سات روز جھڑی رہی، متواتر بارش ہونے سے سڑک جا بجا سے بہ گئی تھی، اور سپرنٹنڈنٹ ٹریفک نے راستہ بند کر دیا تھا۔ اُس نے آہستہ سے جواب دیا اور یہ کہہ کر ایک ہاتھ سے میرے ہاتھ کو پکڑ کر زور زور سے ہلانے لگا۔

اماں کدو چھیل رہی تھیں اور ہم دونوں کو دیکھتی جاتی تھیں۔ اُن کی آنکھیں پُرنم تھیں۔ آنسوؤں کے اِن دو سمندروں میں خوشیوں کی جل پریاں ناچ رہی تھیں +

قبر

وہ کالج میں نیا نیا داخل ہوا تھا۔ پہلے شاید موگہ کالج میں تعلیم پاتا تھا پھر جب اس کا بڑا بھائی لاہور کے ایک بنک میں ملازم ہو گیا۔ تو وہ بھی لاہور آ گیا، وہ بیحد شرمیلا تھا۔ چھریرے بدن کا خوبرو جوان، فراخ پیشانی کھلتا ہوا رنگ، متبسم ہونٹ، وہ ہونٹ جو ایک شرمیلی مسکراہٹ کے باوجود ہر وقت کسی نامعلوم جذبے کے زیر اثر تھرتھراتے رہتے تھے۔ جماعت میں عموماً وہ پچھلے بنچوں پر بیٹھا کرتا۔ اور ہمیشہ ایک کونے میں اُسے کسی نے کبھی جماعت میں کوئی شرارت کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ نہ وہ لڑکیوں پر چاک پھینکتا تھا۔ اور نہ ہی کاغذ کے ہوائی جہاز، اور تو اور اُس نے تو کبھی فاضل پروفیسر کی عمدہ تقریر کے دوران میں ایک پیسہ تک بھی بطور تحسین پروفیسر کی میز پر نہ پھینکا تھا اور پھر ایک دن مجھے پتہ چلا کہ وہ شاعر بھی ہے۔

کالج ہوسٹل میں ہمارے کمرے ساتھ ساتھ تھے۔ اس لئے ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت جلد مانوس ہو گئے تھے۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ لائل پور کا رہنے والا ہے۔ موضع ماموں کانجن، وہ سات بھائی ہیں۔ ایک منیم، ایک وکیل۔ ایک سکول ماسٹر، ایک آڑھتی، ایک بزاز، ایک افیون کا سرکاری ٹھیکیدار اور ساتواں اور سب سے چھوٹا وہ خود ایک طالب علم تھا۔ چھ بھائی تو بیاہے جا چکے تھے اور اُن کی بیویاں اگرچہ کافی بدصورت تھیں۔ مگر "جہیز" کے معاملے میں بہت "حسین" واقع ہوئی تھیں اور اب اُس کی باری تھی۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد ــــــ

شاید اسی امر نے اسے شاعر بنا دیا تھا۔

موسم سرما کی چاندنی راتوں میں جب بادلوں کے ہلکے ہلکے ٹکڑے، پریزادوں

کی طرح آسمان میں اُڑ رہے ہوتے اور ہلکی، نرم سپید چاندنی کا پرتو ہوسٹل کے کنگروں کو کسی پرستانی قلعے کے مناروں کی طرح پراسرار اور حسین بنا دیتا۔ ہم دونوں ہوسٹل کی چھت پر کسی برج میں جا بیٹھتے، میں اُس سے پوچھتا،

"سچ کہنا، کیا تم نے کانن سے زیادہ خوبصورت اور باحیا لڑکی کہیں دیکھی ہے خصوصاً جس دن وہ سپید ساری اور نقرئی آویزے پہنکر جماعت میں آتی ہے تو کیسی پیاری معلوم ہوتی ہے۔ ایمان سے کہنا کیا اُس وقت تمہارا دل یہ نہیں چاہتا کہ ایک ہلکا سا چاک کا ٹکڑا اس طرف پھینکا جائے۔ کہ اُس کے کانوں کے قریب اُس کی سفید ساری کے دلفریب دھاریئے سے چھوتا ہُوا گویا اِسے چومتا ہوا گزر جائے اور ایک چمبیلی کے پھول کی طرح اس کے قدموں میں جا گرے...... ایمان سے، کلاس روم میں بیٹھے بٹھائے خراج حسن ادا کرنے کا اس سے بہتر ذریعہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ کیوں کنھیالال..... اور پرنسپل اور پروفیسروں کی بدذوقی تو دیکھو کہ ہمیں اس قسم کی باتوں پر بھی جرمانہ کرنے سے نہیں چوکتے اور "بدمعاش" اور "لفنگا" کے خطاب الگ بخشے جاتے ہیں۔ جی چاہتا ہے......"

کنھیالال ایک شعر گنگنانے لگا۔ اور پھر اُس نے آہستہ آہستہ مدھم لہجوں میں اپنی داستان محبت کہہ ڈالی، شرمیلی پہلی محبت جو ایک نوزائیدہ کلی کی طرح پتوں میں چھپی رہی۔ اس نے یہ داستان رُک رُک کر بیان کی۔ اُس کے ہلکے مدھم لہجہ میں وہ مٹھاس اور حلاوت تھی۔ جو اس پہاڑی گیت میں ہوتی ہے۔ جسے جنگل کی ہواؤں نے کسی کمسن چرواہے کے نازک لبوں سے پہلی مرتبہ سُنا ہو۔ اُس کی آنکھ میں شرم اور حلیمی تھی۔ جو محبوب کی پہلی نگاہوں میں ہوتی ہے۔ داستاں شروع کرنے سے پیشتر اُس نے ایک بار سوئے مشرق دیکھا۔ کہ اُس کی آنکھوں کی پتلیاں تاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔

ہمارے گھر میں پانی بھرنے کا کام ایک بیوہ برہمنی کے سپرد ہے اُس کی ایک لڑکی ہے رکمن! کنہیا لال نے رُک کر کہا: رکمن کو تم نے نہیں دیکھا۔ اسی لئے کانن کی دن رات تعریف کیا کرتے ہو، رکمن کا ایک چچا ہے، جس نے رکمن کے باپ کے مرنے کے بعد اُس کی تمام جائداد پر قبضہ کر لیا ہے اور لڑکی اور بیوہ براہمنی کو اس سے محروم رکھا ہے۔ اُس نے اپنے مرحوم بھائی کے مکان پر بھی قبضہ کر لیا ہے اور رکمن اور اُس کی ماں کے لئے دو کوٹھڑیاں رہنے کے لئے دے دی ہیں، ماں بیٹی دونوں بڑی مشکل سے دن کاٹ رہی ہیں اور دو تین گھروں میں برتن مانجتی اور پانی وغیرہ بھرتی ہیں۔ ہمارے ہاں اُن کا آنا جانا بہت ہے۔ وہ بیچاریاں جب ہمارے گھر آکر میری بدصورت بھابیوں کو اپنے دُکھڑے سناتی ہیں، تو انہیں بہت رحم آتا ہے۔ اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ صبح یا شام کے وقت رکمن کی ماں رکمن کے چچا کی ایذا پرستی کی ایک نئی داستان سُنا رہی ہیں۔ میرے چھ بڑے بھائی بھی اُن کے گرد جمع ہو گئے ہیں۔ اور رکمن کی شبنم فشاں آنکھوں کی طرف دیکھ دیکھ کر ہمدردی جتا رہے ہیں۔ اُن کا روئے سخن ہمیشہ رکمن کی طرف ہے۔ نہ کہ رکمن کی ماں کی طرف، مثلاً بات تو کر رہی ہے رکمن کی ماں۔ لیکن میرے بڑے بھائی جو سیٹھ رنچھور لال کے ہاں منیم ہیں، رکمن سے کہہ رہے ہیں۔

"اچھا رکمن تو ہمارے ہاں چلی آ، ہم یہاں تجھے کوئی تکلیف نہ ہونے دینگے، ہے نا!"

اور پھر باقی پانچوں بھائی سر ہلا کر کہتے ہیں، ہاں، ہاں، بھلا رکمن کی ماں اور رکمن تمہیں اپنے چچا کے ہاں رہنے کی کیا ضرورت ہے ہمارے آجاؤ نا رکمن!"

انسانی ہمدردی کے اس شدید مظاہرے کے وقت میری بھابیوں

کی صورتیں دیکھنے کے لائق ہوتی ہیں۔ یا پھر کبھی یوں ہوتا۔ کہ رکمن ہمارے گھر
اداس اور غمگین صورت بنائے آتی؟ اور
پہلا بھائی۔ کیا بات ہے رکمن؟
دوسرا بھائی۔ رکمن، کیوں، کیا بات ہے؟
تیسرا بھائی۔ رکمن اداس کیوں ہو؟ رکمن؟
چوتھا بھائی۔ کیا کسی نے تجھے کچھ کہا ہے؟
پانچویں بھائی کی باری آنے سے پہلے ہی رکمن پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی
اور سسکیوں کے درمیان کہتی جاتی۔ چچا نے ماں کو آج پھر پیٹ ڈالا....
چچا نے...... چچا نے..... ہوں..... ہوں......
پانچویں بھائی نے گرج کر کہا "چچا نے مارا؟...... کیوں اُسے کیا حق
ہے تمہاری ماں کو پیٹنے کا؟ وہ کہاں سے آیا سالا، حرامزادہ، شہدا، کیوں جی؟
میں پوچھتا ہوں اسے تمہاری ماں کو پیٹنے کا کیا حق ہے؟
اور چھٹے بھائی ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر کہتے "کمبخت آج ملا راستے میں کہیں
تو اُس سے پوچھ لوں گا۔ کہ ایک غریب بیوہ کو کس طرح ستایا جاتا ہے؟"
چھٹے بھائی کی لال لال آنکھیں دیکھ کر رکمن ڈر جاتی اور آہستہ سے کہتی۔
نہ، نہ بھیا تم کہیں اُنہیں مار نہ بیٹھنا۔۔ پھر تو آفت ہی آ جائے گی۔"
اور چھٹے بھائی اسی "آفت" کے آجانے کے خیال سے چپ ہو رہتے۔ یوں بھی
تو ہم میں سے کون اتنا دلیر تھا۔ جو رکمن کے چچا سے جا کر لڑتا۔ وہ تو ایک بڑا
ہی بدمعاش، چھٹا ہوا، پرلے درجے کا بدطینت آدمی تھا۔ اُس سے لڑائی
مول لینے کو کون تیار تھا۔ یہ ہمدردی کا شدید جذبہ تو میرے بھائیوں کے دل
میں محض اسی لئے بار بار طوفانی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ کہ رکمن ایک نہایت

ہی انجان، بھولی بھالی، معصوم اور بحد خوبصورت دوشیزہ تھی اور میرے بھائیوں کی بیویاں بہت ہی چالاک، فربہ اندام اور بدصورت تھیں اور پھر انہیں آج تک اپنے متوسط طبقے کی معاشرت میں کسی حسین لڑکی سے باتیں کرنے اور اُس کے ساتھ ہمدردی جتلانے کا موقع نہ ملا تھا۔ جب وہ بیچارے دن بھر کی محنت و مشقت کے بعد تھکے ماندے گھر واپس آتے تو اکثر اپنی جاہل اور پھوہڑ بیویوں کو یونہی چھوٹی چھوٹی نکمی باتوں پر لڑتے جھگڑتے دیکھتے اِس امر کا نفسیاتی ردِ عمل تم جانتے ہو ایک ہی صورت اختیار کر سکتا تھا۔

"عشق یا ہوس" میں نے آہستہ سے پوچھا

"کچھ سمجھ لو" کنہیا لال نے متین لہجہ میں جواب دیا" یہ ایک ہی جذبہ کے دو مختلف مدارج ہیں، میرے بھائیوں کو رکمن سے باتیں کرنے میں جو مزہ آتا تھا اسے حاصل کرنے کے لئے اور اِس کی لذت سے بہرہ ور ہونے کے لئے وہ مختلف طریق استعمال کرتے تھے، لیکن اگر اِن تمام طریقوں کو اکٹھا کرکے انہیں جزیاتی صورت میں دیکھنے سے احتراز کیا جائے اور بحیثیت مجموعی ان پر نظر ڈالی جائے۔ تو وہ تمام طریقے ایک تسلسل ——— کی صورت اختیار کر لیتے ہیں

مثلاً تمام بھائیوں کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اپنے جذبہ ہوس کو ایک دوسرے سے چھپائے رکھیں۔

جہاں تک ہو سکے رکمن سے اُس وقت بات کی جائے۔ جب اور کوئی بھائی وہاں موجود نہ ہو۔

رکمن پر اپنی ذاتی ہمدردی، خاندان کے دیگر اراکین سے الگ تھلگ ہو کر جتائی جائے۔

یہ ثابت کیا جائے کہ سچی ہمدردی صرف اسے ہو سکتی ہے اور باقی سب بھائی یونہی دکھاوے کے لئے باتیں بناتے ہیں وغیرہ .... اور تم؟" میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "تم ساتویں بھائی تھے اور غالباً بہت شریف......"

کنہیا لال شرما سا گیا۔ کہنے لگا "میں؟ تو اسے دیکھتا ہی رہتا حتیٰ کہ وہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی۔ اُس کی باتیں سنتا ہی رہتا، یہاں تک کہ وہ خاموش ہو جاتی اور پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگتی، میں تمہیں کیا بتاؤں، میں اُسے کس قدر چاہتا تھا، چاہتا ہوں۔ رکمن کے آتے ہی میری حالت متغیر ہونے لگتی، خون کی روانی تیز ہونے لگتی، طاقت گویائی سلب ہو جاتی۔ میں اُس سے بات کرنا چاہتا۔ لیکن نہ کر سکتا۔ بس ٹکٹکی لگا کر اُس کی طرف دیکھتا رہتا، تمہیں کیا بتاؤں وہ کس قدر حسین ہے اور جب وہ مسکراتی ہے تو اُس کے لبوں کی داہنی طرف ایک نہایت دلفریب خم پڑتا ہے، جسے دیکھ کر میں اکثر دیوانہ ہو گیا ہوں۔

کنہیا لال رُک گیا، پھر ذرا ٹھہر کر بولا۔

پچھلی گرمیوں کی چھٹیوں میں میں نے کئی بار سوچا کہ اگر اُسے رکمن! رکمن! میری جان رکمن! یہ کہہ کر بلاؤں تو پھر کیا ہوگا، کیا وہ مجھے گالیاں تو نہ دے گی۔ کیا وہ اپنی ماں سے جا کر تو نہ کہے گی۔ اپنے بھائیوں اور بدصورت بھابیوں کا تو مجھے مطلق خوف نہ تھا۔ آخر میں نے تہیہ کر لیا کہ رکمن سے بات کروں، میں نے دل میں سوچا کہ اس طرح خاموش محبت کرنے سے تو مر جانا ہی بہتر ہے۔ آخر ہوگا کیا، یہی نا، کہ وہ میری محبت ٹھکرا دیگی۔ میں اُس سے یہ کہونگا۔ اور وہ مجھے یوں جواب دے گی۔ جس کے جواب میں میں اسے یہ کہوں گا، اور وہ کہیگی کہ مجھے تو ڈر لگتا ہے؟

اور میں کیوں گاگر ڈر گیا! رکمن، جب وہ دل جنت کرنے پر تلی جائیں تو دنیا کی کوئی طاقت انہیں نہیں روک سکتی اور پھر وہ ایک شرمیلی ادا سے اپنے بازو میرے گلے میں حمائل کر دے گی۔ اور میں پیار بھری نگاہوں سے......

لکایک ایک کھڑکا سا ہوا، میں چونک پڑا۔ سامنے دیکھا تو رکمن کھڑی تھی، سر پر پانی کی گاگر اُٹھائے ہوئے اُس کے ماتھے پر زلفیں بل کھائے بھیگی پڑی تھیں اور اُس کی لانبی لانبی پلکیں بھی پانی کے قطروں سے جھکی پڑی تھیں۔ بڑی مشکل سے اُنہیں اوپر اُٹھا کر میری طرف دیکھ کر کہا۔ کاہن ذرا گاگر تو اُتروا دو۔"

"میں وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ آج کتنا اچھا موقع تھا۔ گھر میں کوئی بھی نہ تھا، نہ بھائی نہ بھابیاں، کتے بلیاں سب غائب تھے۔ کیسا عجیب اتفاق تھا۔ میں ایک گھبرائے ہوئے۔ بیلج کے بچے کی طرح رکمن کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں نے کہا کاہن (وہ مجھے کاہن کہا کرتی ہے) ذرا گاگر اتروا دو، کھڑے کھڑے کیا دیکھ رہے ہو۔"

میں نے گاگر اتروا دی

رکمن دالان کے ایک ستون کا سہارا لیکر کھڑی ہو گئی۔ وہ ہانپ رہی تھی، چہرہ لال تھا۔ زلفیں لہرائی ہوئیں، "کیا کر رہے ہو؟" رکمن نے یونہی پوچھا۔

"کچھ نہیں..... کچھ نہیں..... میں نے ایک مجرم کی طرح جواب دیا

وہ ہنسی یونہی ایک دلکش ہنسی، جیسے کسی مست رقاصہ کے گھنگرو ایک دم بج اُٹھیں۔ پھر وہ چپ ہو گئی اور چند لمحوں تک کامل خاموشی رہی

"بھابیاں کہاں ہیں؟" اب پھر رکمن نے پوچھا اور اپنی جبین کے بال درست کرنے لگی۔

پنڈت چھگو رام کے ہاں کتھا ہے وہاں گئی ہیں؟

اچھا! اُس نے "اچھا"! کچھ اِس طرح مدھم اور رازدارانہ لہجہ میں کہا کہ میں نے سمجھا گویا ہوا کا کوئی لطیف جھونکا نیم کے نکیلے جھومروں میں نغمہ حیات پیدا کرتے ہوئے گزر گیا۔

پھر تھوڑی دیر کے بعد اُس نے اپنی کمر کو جھٹک دیا، اپنے شانوں کو جھٹک دیا اپنی گردن کو جھٹک دیا۔ اور یہ سب کچھ بالکل غیر شعوری طریق پر ہوا، اُس کے بعد اُس نے لااُبالیانہ انداز میں کہا" اچھا کاہن میں چلتی ہوں۔

وہ چلی گئی۔

اے اے رکمن! میرے مُنہ سے بے اختیار نکلا

وہ ڈیوڑھی سے لوٹ آئی" کیا کہتے ہو؟ اُس کا چہرہ بالکل بھولا بھالا اور ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔

میری آنکھیں نیچی ہو گئیں، اور چہرہ بھی لال ہو گیا۔ کچھ نہیں۔ کچھ نہیں رکمن" میں نے آہستہ سے کہا۔

وہ کچھ دیر تک وہاں کھڑی رہی اور میں اُس سے نگاہیں نہ ملا سکا۔ پھر میں نے دیکھا کہ اِس کے قدم آہستہ سے ڈیوڑھی کی طرف مڑ گئے۔

وہ جا رہی تھی۔

ارے، بیوقوف، گدھے، وہ جا رہی ہے۔

میں بھاگ کر ڈیوڑھی کی طرف گیا۔ وہ اِس تنگ و تاریکی ڈیوڑھی میں سے گزر رہی تھی۔ میں نے دوڑتے دوڑتے رک جانا چاہا، لیکن میرے قدم مجھے اُس کے پاس لے ہی گئے، میں نے اُسے بازوؤں سے پکڑ لیا اور کانپتے ہوئے لہجہ میں کہا۔ رکمن، رکمن، میری بات سنو اور نہ بیشتر اِس کے کہ وہ میری بات سن سکتی۔ میں نے اپنے لب اِس کے لبوں پر رکھ دیئے۔

رکمن کے بدن میں سر سے پاؤں تک ایک جھرجھری سی آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو مجھ سے جدا کیا۔ اور پھر ایک زور کا طمانچہ میرے منہ پر رسید کیا۔ اور ایک زقند لگا کر ڈیوڑھی سے باہر نکل گئی۔

میں رکمن کے پیچھے بھاگتا ہوا گیا، بیوقوفوں کی طرح پیچھے بھاگ رہا تھا۔ اور دل میں ڈر رہا تھا۔ اگر اُس نے کسی سے کہہ دیا تو پھر...... رکمن ذرا ٹھہر تو سہی، تجھے پرماتما کی سوگند، رکمن!

لیکن رکمن روتی ہوئی، آنچل سے آنسو پونچھتی ہوئی آگے آگے بھاگی جا رہی تھی اور زور زور سے کہہ رہی تھی! ابھی ماں جی سے کہوں گی، ابھی چچا سے کہوں گی، ابھی چچا سے کہوں گی..... ابھی تمہارے بڑے بھائیوں سے کہوں گی۔

کیا ہوا رکمن، تو میری بات تو سن لے، تجھے دیوی کی سوگند اگر تو کسی سے کچھ کہے تجھے گائے ماتا کی قسم۔

رکمن ٹھہر گئی اور آتش بار نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر بولی "ایسی سوگندیں دیتے ہوئے تمہیں شرم تو نہیں آتی"

اب ہم دوڑتے بھاگتے گھر سے دور نکل آئے تھے۔ یہاں چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے اور ایک ریتیلا میدان، جس میں کہیں کہیں آک کی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں، میرے ایک درختوں کا جھنڈ تھا۔ اور اس کے پیچھے رکمن کے چچا کا گھر۔ اُس جھنڈ کی اوٹ میں سورج غروب ہو رہا تھا۔ اور کوے کائیں کائیں کرتے ہوئے مغرب کو بھاگ رہے تھے، سورج کی شعاعوں میں اُن کے پَر سونے کے بنے ہوئے معلوم دیتے تھے۔ میرے سامنے رکمن کمر پر ہاتھ رکھے ایک عجیب شان دلربائی سے کھڑی تھی۔ اُس کے آنچل کے تاروں سے سورج کی کرنیں چھن چھن کر آ رہی تھیں۔

اب کبھی چھیڑو گے؟" رکمن نے ملائم لہجہ میں کہا

میں نے سر ہلا دیا۔ "ہرگز نہیں"

وہ ایک ٹیلے پر بیٹھ گئی اور پاؤں سے ریت کرید کرید کر ایک محراب سی بنانے لگی۔ جب محراب بن گئی۔ تو اُس نے آہستہ سے اپنا پاؤں محراب کے نیچے سے نکال لیا، اب ریت کی محراب تیار ہو چکی تھی۔ رکمن نے فتحمندانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"یہ کیا ہے ؟" میں نے مسکراتے ہوئے اُس سے پوچھا

"یہ تمہاری قبر ہے!" رکمن نے شوخی سے کہا اور پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

شریر لڑکی چیخ چیخ کر ہنس رہی تھی۔

"لاؤ ذرا دیکھیں تو" میں نے اُسے پرے دھکیل کر کہا اور پھر لات مار کر ریت کی محراب کو مسمار کر دیا۔

اوف...... اُس کی ہنسی فوراً بند ہو گئی۔ یہ تم نے کیا کر دیا (ہاتھ بڑھا کر) لگاؤں ایک طمانچہ اور......

میں نے سر جھکا کر کہا: "ضرور، اب ایک نہیں ایک سو طمانچے لگاؤ، اگر اُف کر جاؤں تو کہنا"

وہ گھر جانے کے لئے آہستہ سے مڑی اور ڈوبتے ہوئے سورج کے تپتے ہوئے سنہری سیال نے یکایک اُس کے رُخ کو روشن کر دیا۔ اُس کی نگاہوں میں ایک عجیب چمک تھی، جاتے جاتے اُس نے مدھم لہجہ میں کہا۔

ہم گھر جا کر کہیں گے کہ کاہن، بڑا بدمعاش ہے!......

اتنا کہہ کر کنہیا لال رُک گیا۔

پھر؟ میں نے بے صبری سے پوچھا۔

...... پھر؟" کنہیا لال نے آہستہ سے کہا...... پھر گرمی کی چھٹیاں ختم

ہو گئیں اور میں یہاں چلا آیا۔

ہم دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے آرہے تھے اور پرے پیپل کے درخت کی ایک ٹہنی میں چاند ایک ٹوٹے ہوئے کنگن کی طرح اٹک گیا تھا، نیچے سڑک پر ایک پوربیا گاڑیبان "پتیم کیوں بھیو اداس" گاتے ہوئے بیل گاڑی چلاتا ہوا گزر رہا تھا۔

بہت دیر کے بعد میں نے کنہیا لال سے پوچھا۔ "اور رکمن!"

کنہیا لال مسکرا کر کہنے لگا۔ "میرے بھائی اپنی غلطیوں کا خمیازہ مجھے بھگتنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ انہوں نے روپیہ چاہا انہیں روپیہ مل گیا، اب وہ اپنی بدصورت بیویاں دیکھ کر کڑھتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں۔ کہ میری شادی بھی کسی موٹی، سانولی، اجڈ، گنوارن سے کر دی جائے۔ لیکن میں روپیہ نہیں مسرت چاہتا ہوں اور مسرت کا نام رکمن ہے اور یہ بات رکمن بھی اچھی طرح سے جانتی ہے۔

"یہ بات ہے!" میں نے سر ہلا کر کہا۔

"ہاں!"

بات ختم ہو گئی اور ہم دونوں برج پر سے اٹھ بیٹھے، لیکن نیچے سڑک پر گزر جانے والے گاڑیبان کے لئے بات ابھی پوری نہ ہوئی تھی۔ وہ ابھی تک گاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ پتیم کیوں بھیو اداس! پتیم کیوں بھیو اداس.....!

میرے لئے کالج کی زندگی بہت جلد ختم ہو گئی۔ بہت سالوں کے بعد مجھے ایک دن پھر کنہیا لال ملا۔ میں لاہور بسلسلہ سیاحت آیا تھا۔ کرسمس کے دن تھے۔ اور انار کلی میں بہت رونق تھی۔ یونہی گھومتے گھومتے کنہیا لال مل گیا!

ارے!

میں نے اُسے بہت مشکل سے پہچانا۔ اس کا کھلتا ہوا رنگ اب دھوئیں کی طرح میلا ہو گیا تھا۔ جبین شکن آلود تھی۔ آنکھیں اندر کو دھسی ہوئیں۔ ہونٹ خشک اور چہرے پر پرچھائیاں جسم سوکھے ہوئے بانس کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ ایم۔ اے انگریزی میں اول رہا اور اب لاہور میں کسی کالج میں پروفیسر ہے۔

مگر تمہیں ہوا کیا؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

میرا سوال سُن کر وہ آہستہ لیکن بیحد تلخ لہجہ میں بولا "میرا عقیدہ ہے کہ ہندو کی موجودہ معاشرت میں عورت کو باعزت طریق پر حاصل کرنا ناممکن ہے یہاں شادیاں ہوتی ہیں۔ لیکن محبت نہیں ہوتی۔ ہمارے ماں باپ ہمیں سب کچھ معاف کر سکتے ہیں۔ ہمارے عیب چھپا سکتے ہیں۔ قتل، چوری، ڈاکہ، بد دیانتی، لیکن وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے۔ کہ کوئی اُن کی مرضی کے خلاف کسی لڑکی سے محبت کرنے کی جرأت کرے۔ نتیجہ؟ نتیجہ تم کہو گے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ رکمن براہمنی تھی، اُسے ایک پچاس سال کا بوڑھا لیکن امیر براہمن بیاہ کر لے گیا۔ میں غریب تھا، میرے پلے ایک چھڑی تھی۔ گھگیا گھگیا کر باتیں کرنے والی بنیاین باندھ دی گئی۔ بوڑھا براہمن چند مہینے ہوئے رام رام کرتا ہوا اس دنیا سے چل بسا اور اب کمسن اور حسین رکمن بیوہ ہے، ماں بھی بیوہ اور بیٹی بھی بیوہ، وہ اب میلے کپڑے پہنتی ہے اور سر جھکا کر چلتی ہے۔ جیسے اپنے بوڑھے خاوند کی موت کی ذمہ وار ہے۔

میں نے بات کا رخ پلٹنا چاہا۔ چنانچہ میں نے آہستہ سے کہا۔ "سناؤ تمہارے بال بچے تو ہوں گے۔ راضی خوشی ہیں۔

جیسے اُس نے میری بات کا غلط مطلب لے لیا ہو۔ وہ ملامت بار نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر بولا۔ بچے پیدا کرنے کا یہ مطلب کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ مجھے اپنی بیوی سے محبت ہے، شادی ایک سودا ہے، دیگر اشیا کی طرح لڑکے لڑکیاں بھی سیم و زر کے انباروں کے عوض بیچے جاتے ہیں اور یہ طریق موجودہ نظام زندگی کے عین مطابق ہے اور بچے"......

وہ ایک تلخ ہنسی ہنسکر کہنے لگا۔ بچے تو ایک کامیاب شادی کا جزو لاینفک ہیں اور پرماتما کا شکر ہے۔ کہ ہندوستان میں ننانوے فی صدی شادیاں اِس لحاظ سے کامیاب ہوتی ہیں۔ تمہیں میرے بچوں کا حال سُن کر حیرت ہوگی۔ میں چھ بچوں کا باپ ہوں۔ رینگتے ہوئے بچے، لبورتے ہوئے بچے، چیختے ہوئے بچے" اور میری طرف غصّہ بھری نظروں سے دیکھ کر بولا" اِس میں میرا کیا قصور ہے۔ پچیس چھبیس سال کی جنسی فاقہ پرستی کے بعد اگر ہندی نوجوان کی زندگی میں ایک عورت آجائے۔ تو وہ کیوں نہ چُوم چُوم کر اُس کا حلیہ لگاڑ دے مگر شرط یہ ہے۔ کہ وہ عورت ہو۔ کوئی عورت، ایک کانی عورت، بھینگی عورت ایک عورت جس کی شکل تمہارے کوٹھے کے پرنالے سے بھی زیادہ ہو، مگر وہ عورت ضرور ہو"

اُس کا سانس پھُول گیا اور وہ کھانسنے لگا۔ کچھ مضائقہ نہیں۔ اب تھوڑے دن رہ گئے ہیں۔ اب رات کو مجھے بخار بھی ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی کھانسی کے ساتھ خون کے قطرے بھی آجاتے ہیں۔ اب جلد ہی اِس قید سے چھوٹ جاؤں گا، لیکن مجھے اپنی فکر نہیں، مجھے فکر ہے تو صرف یہ کہ میں جتنا روز بروز دُبلا ہو رہا ہوں۔ میری بیوی اتنی ہی موٹی ہوتی جا رہی ہے۔

میں ہنسا۔ "بھائی کنہیا لال معلوم ہوتا ہے۔ تمہارا دماغی توازن برقرار نہیں

رہا۔ ذرا کسی پہاڑ پر چلے جاؤ، جو ہونا تھا ہو چکا، خوش رہا کرو۔ دیکھو میاں کتنی چہل پہل ہے۔ یہ دلفریب ساریاں، بنکروں کے قہقہے، رومان اور خوشی رومان اور خوشی ؟" کنہیا لال نے جھنجلا کر کہا۔ اُس کی آنکھیں بے نور ہو گئیں۔ اور وہ پہلے سے بھی بدصورت نظر آنے لگا۔ "تم اُن لوگوں کی خوشی کا غلط اندازہ کر رہے ہو، یہ لوگ پیدا ہونے سے پہلے مر چکے ہیں۔ اُن کا گلا اُنکے ماں باپ نے خود اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دیا ہے۔ یہاں نہ رومان ہے نہ خوشی، یہ تو چلتی پھرتی لاشیں ہیں، لاشیں "

وہ رک گیا اور پھر میری طرف عجیب نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔" تم جانتے ہو، جہاں رومان اور خوشی نہیں ہوتے وہاں کیا ہوتا ہے؟...... وہاں ہوتا ہے!......

مذہب مذہب اور صرف مذہب اب رکمن مجھ سے بات تک نہیں کرتی۔ وہ دن رات مالا جپتی ہے۔ اور اپنے آپ کو اور مجھے دونوں کو پاپی سمجھتی ہے! ہاہاہاہا!

کنہیالال زور زور سے ہنسنے لگا۔

کنہیا لال کی ہنسی نے بے اختیار میرے جسم کے رونگٹے کھڑے کر دیئے، میرے سارے جسم میں ایک جھرجھری سی آئی اور میرے جسم کے رو ئیں روئیں کو کانپتا ہوا چھوڑ گئی، پتہ نہیں کیوں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ کنہیالال کے پچکے ہوئے گالوں کو دیکھ کر مجھے بے اختیار وہ ریت کی قبر یاد آ گئی۔ جو ایک شام غروب آفتاب کے وقت کالجن کے ایک ریتیلے میدان میں ایک پنجابی دوشیزہ نے اُس کے لئے تیار کی تھی +

گوماں

نام ہے گومتی، پنڈت جی پیار سے گوماں کہا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ مجھے اِس سے ایک طرح کا اُنس ہے۔ حقیقتاً یہ ہے۔ کہ اِس سے پیار کرتے ہیں اُس کی محبت کا دم بھرتے ہیں۔ اِس کے چاہنے والوں میں سے ہیں۔ اپنا نام اِسطرح جان نثاروں میں لکھولتے ہیں۔ کہ لوگ۔ اُنہیں گومتی کا "عاشق تصور کریں۔

مجھ سے کئی بار اِس معاملے پر بحث کر چکے ہیں۔ "دیکھو بھئی میں مفت میں بدنام ہو رہا ہوں۔ لوگ طعنے دیتے ہیں، اِس بیچاری کو، لیکن اگر سچ پوچھتے ہو تو تم جانتے ہو۔ میں تم سے کوئی بات نہیں چھپاتا، دھرم سے کہتا ہوں اور تم جانتے ہو مجھے دھرم سے بڑھ کر اور کوئی چیز پیاری نہیں۔ مجھے گومتی سے اُنس ہے، بس اُس اُنس میں گناہ کا شائبہ تک بھی نہیں۔ لوگ یونہی بدنام کرتے ہیں" ایک لمبی سانس لیکر......

"میرا کیا ہے اکیلی جان ہوں کچھ کٹ گئی ہے کچھ کٹ جائے گی مجھے تو اِس بیچاری کی فکر ہے، اور اگر اِس کے خاوند کو پتہ لگ جائے تو پھر کیا ہو، تم جانتے ہو، مرد کتنے شکی مزاج ہوتے ہیں۔ اور عورتوں کو اپنا ناموس کس قدر عزیز ہے، گو میری محبت پاکیزہ ہے، تم جانتے ہی ہو، سانچ کو آنچ نہیں۔ پھر بھی .... خلق کا منہ کون بند کر سکتا ہے، تم جانتے ہی ہو۔ اچھا چھوڑو اِس معاملے کو، لوگ یوں ہی شوشے چھوڑ دیا کرتے ہیں، ہمارا دل صاف ہے۔ لوگ جو چاہیں بکیں۔ آؤ چائے پئیں!"

اور پھر ہم چائے پینے میں مشغول ہو جاتے!

پنڈت جی بڑے مشہور ڈاکٹر ہیں۔ قصبہ اور آس پاس گاؤں کے تمام ڈھور

ڈگراں کے پاس بغرضِ علاج آتے ہیں، اُن کا پورا نام ہے۔ پنڈت بام دیو اگنی ہوتری آف سلوتری۔ میں نے انہیں اکثر اسی طرح دستخط کرتے دیکھا ہے لوگ انہیں صرف "پنڈت جی" کہکر پکارتے ہیں، یوں بھی دیکھنے میں اچھے خاصے بدصورت ہیں۔ اور انہیں اپنی کم مائگی کا اتنا ہی احساس ہے جتنا ایک حسین کو اپنے حُسن کا۔

ایک دن آئینہ سامنے رکھے مونچھوں کو تیل لگا رہے تھے یکایک بول اُٹھے۔

"لال حسین، تمہیں پتہ ہے کنکریٹ کیا ہوتا ہے؟"

میں نے جواب دیا "نہیں۔ تو"

"دیکھو ہم تمہیں بتائے دیتے ہیں، کنکریٹ وہ مسالہ ہے جس سے خالق باری نے بیسویں صدی کے انسان بنائے۔ یہ بات سائنسدانوں نے بڑی کھوج کے بعد دریافت کی ہے انہوں نے اس مسالہ کو تیار بھی کر لیا ہے مگر اس سے وہ انسان تیار نہیں کر سکے۔ اگر وہ ایسا کر سکیں تو ان میں اور پرمیشر میں کیا فرق رہ جائے یہ سچ ہے نا"

"بجا فرمایا آپ نے"

"تو دیکھو نا۔ ہم تم سب اس مسالے سے بنے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ خدا نے آپ لوگوں کو پہلے بنایا اور مجھے سب سے آخر"

"وہ کیسے؟"

"بڑی سیدھی بات ہے، دیکھو نا۔ جب خدا سب لوگوں کو بنا چکا تو جو بچا کھچا مسالہ پڑا تھا اُسے دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا۔ آخر اس کا کیا کیا جائے، بہت غور و خوض کے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اس سے ایک ایسا مجسمہ تیار

کیا جائے جو سب سے انیلا ہو، اپنی نظیر آپ ہو، جس کے رعبِ حسن سے عورتیں غش کھا جائیں۔ بچے ماؤں کی گودیوں میں چھپ جائیں۔ جس کے جلال سے مردوں کے پیٹ میں بل پڑ جائیں ہنستے ہنستے قولنج ہو جائے۔ وہ نوری مجسمہ میں ہوں ذرا دیکھو تو ـــــ ناک اندر دھنسی ہوئی۔ چیچک کے داغ۔ بہاشے اور یہ ہونٹ پکے ہوئے انجیر کی طرح پھٹے ہوئے۔ یہ کہہ کر آپ نے آئینہ زور سے میز پر پٹخ دیا۔ اور لگے آپ کو گالیاں دینے

پھر کچھ دیر ٹھہر کر گنگنانے لگے۔ عشق تیرے میں صنم۔ میں نے صنم بول سنے کس کس کے۔ کس کس کے! کس کس کے!!"

آدمی کے مزاج میں تلوّن کو کتنا دخل ہے، یہ دیکھ کر میں بے اختیار ہنسنے لگا، پھر وہ بھی میرے ساتھ ہنسنے لگے، ہا ہا ہا۔

گومتی حسین ہے۔ مگر اُس کا حسن الجبرے کا فارمولا نہیں۔ ایک فنکار اس میں ہزاروں نقائص دیکھ سکتا ہے۔ اس کے سینکڑوں عیوب بیان کر سکتا ہے، یہ ہوتے ہوئے بھی اُس کے حسن میں کچھ ایسی دلکشی و جاذبیت ہے جو دل کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ مجھے اس کی آنکھیں بہت پسند ہیں۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، ناگوری گائے کی طرح مست۔ اور پنڈت جی کو اس کی ٹھوڑی اور وہ شیریں لوچدار آواز پسند ہے جسے سن کر ان کا دل کسی نامعلوم مسرت سے کانپنے لگتا ہے۔ قصبہ کے حاکم اعلیٰ یعنی نائب تحصیلدار صاحب بھی اسے اکثر تعریفی نگاہوں سے دیکھا کرتے ہیں۔ گومتی اِن تعریفی نگاہوں سے خوش ہو جاتی ہے۔ یہ خیال کہ وہ حسین ہے اور لوگ اُسے چاہتے ہیں۔ اسے ہر دم مسرور رکھتا ہے، وہ اپنے خاوند پر حکومت جتا سکتی ہے۔ اُس سے ایک نئے زیور کی فرمائش کر سکتی ہے،

روٹھ جاتی ہے، اور پھر چاہتی ہے کہ اُس کا خاوند اُسے منائے۔ وہ تین بچوں کی ماں ہے۔

اُس کا خاوند ایک غریب دوکاندار ہے۔ قصبے کے چھوٹے سے بازار میں ایک سرے پر چھوٹی سی دوکان ہے۔ نمک، آٹا، تیل، کھدر اور گجرے وغیرہ بیچتا ہے۔ قد ٹھنگنا، منحنی صورت۔ زن مرید، گومتی کو اُس سے کیسے محبت ہو سکتی ہے، یہ بات میری سمجھ میں آج تک نہ آئی۔ اُس کے کپڑے عموماً میلے رہتے ہیں، بیچارہ ہر وقت دکان پر بیٹھا رہتا ہے ہمارے قصبہ کی دُکانیں شام کے چھ بجے بند ہو جاتی ہیں۔ مگر بارہا جب ہم سیر کر کے شام کو آٹھ ساڑھے آٹھ بجے گھر لوٹے ہیں، گومتی کے غریب خاوند کو ہم نے دکان پر ہی بیٹھا پایا ہے اور اُس وقت شمع کی جھلملاتی ہوئی لو میں اُس کا چہرہ کتنا عجیب نظر آتا ہے، وہ بودھ لوک کے دلائی لامہ کی طرح "صم" بکم" بیٹھا ہوتا ہے۔ وہ کیا سوچتا ہے؟ شاید وہ سوچتا ہی نہیں، یا شاید وہ کسی گاہک کا انتظار کر رہا ہے، ایسے گاہک کا جو کبھی آئیگا ہی نہیں ——— یا شاید الف لیلہ کا ایک بونا ہے۔ کہ محفل ہزار داستاں سے اُٹھ کر ہماری اِس خاموش، خشک، رومان سے خالی دنیا میں چلا آیا ہے اور انتظار کر رہا ہے اُس زمانے کا جس کی حقیقت آج محض افسانوی ہے، منتظر ہے۔ اُس کائنات کا جس میں ہارون الرشید، ابوالحسن، الہ دین، مینہ اور یکبارہ لیتے ہیں، کبھی اُس کی دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے یکایک ٹھٹھک کر رہ جاتا ہوں اور جب وہ اپنے شانے سکیڑے گردن نیچی کئے ہوئے بیٹھا ہوتا ہے۔ تو مجھے ایسا احساس ہوتا ہے کہ کوئی منتر پڑھ رہا ہے۔ زمین پر کچھ پڑھ کر پھونک رہا ہے جس کے سحر سے یہ زمین ابھی پھٹ جائے گی اور ایک جن نمودار ہو گا۔ جو رعد کی سی آواز میں بولے گا "کیا چاہئے؟" ——— مگر ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ اِس رومانیت

سے خالی دُنیا میں ایسا کبھی نہیں۔ بلکہ ہر بار یہی ہوتا ہے کہ وہ غریب بنیا بول اُٹھتا ہے +

"کیا چاہئے، بابو جی؟"

اور میں جلدی سے گھبرا کر جواب دیتا ہوں "تین انڈے مُرغی کے!"

اور پھر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ الف لیلہ کا بونا نہیں، ایک غریب دوکاندار ہے گومتی کا خاوند، گومتی جسے میں اور نائب تحصیلدار صاحب تعریفی نگاہوں سے دیکھا کرتے ہیں۔ اور بس ـــــ اِس دُنیا میں حُسن ہے مگر رومان نہیں، محبت ہے مگر مجنوں نا پید، شاید یہی سوچ کر عمر خیام کو دُنیا کے نامکمل ہونے کا احساس ہُوا ہوگا۔

پنڈت جی دن میں دو بار آٹھ آنہ تول افیم کی چسکی لگاتے ہیں، افیون کی اتنی مقدار غالباً ہندوستان کے آٹھ دس بیکار نوجوان گریجوایٹوں کو ابدی سکون عطا کر سکتی ہے۔ اور ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کو گھٹانے میں ضبط تولید سے زیادہ ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ ہمارے اصلاح پسندوں کو مصنوعی اور غیر قدرتی طریقے چھوڑ کر اِس نعمت خداداد کی طرف رجوع کرنا چاہئے، کیا عجب کہ اسی سے قوم کا بیڑا پار ہو جائے، پنڈت جی سے پوچھئے چسکی لگا کر کیسی روح پرور باتیں کرتے ہیں۔ اور پھر لالہ سے چودہ چھٹانک دیسی شراب پی کر کس طرح ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو جاتے ہیں۔ اِس وقت دنیائے سیاست کی باگیں اُن کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔ اور کل کائنات کے اسرار و رموز ان کے نطق میں ایسی حالت میں جو دوا وہ تجویز کر دیں۔ بیمار حیوانوں پر اکسیر کی طرح اثر کرتی ہے۔ اِس وقت کتنے ہی لوگ کہ جن کے ڈھور ڈنگروں نے اُن سے شفا حاصل کی ہے اِن کے جان و مال کو دعائیں دے رہے ہیں، کسی پیر

سادھو کے استھان کی طرح شفا خانے بیں لوگ آپ ہی آپ دودھ مکھن، پنیر، پھل لئے آ رہے ہیں۔ پنڈت جی نیک آدمی ٹھہرے۔ جو چیز دلی عقیدت سے پیش کی جائے اُسے کسی طرح نہ قبول کریں طرفہ یہ کہ اکیلی جان، کیا کھائیں اور کیا نہ کھائیں، چنانچہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ دودھ، مکھن، پنیر اور پھلوں کا بیشتر حصہ گوماں کے گھر پہنچا دیا جاتا ہے، ویسے بھی انہیں گوتمی کی لڑکیوں رانی اور بملا سے بہت الفت ہے۔ یہ سب اشیا بچّوں کے لئے بھیجی جاتی ہیں اور غالباً اسی لئے قبول کی جاتی ہیں، رانی بڑی شوخ و طرار ہے، پنڈت جی سے ہر روز کسی نہ کسی چیز کی فرمائش کر دیتی ہے۔ مگر یہ فرمائشیں اکثر شکر کی ڈلی سے لیکر سیب کی گٹھریا تک ہی محدود رہتی ہیں۔ صبح سیر کرتے ہوئے وہ راستے میں گوتمی کے گھر سے رانی یا بملا کو اُٹھا کر سیر کے لئے جاتے ہیں، اور شام کو ایک ہی کھاٹ پر بیٹھ کر گوماں سے گپ اڑاتے ہیں۔ ان دونوں کو اس طرح بیٹھے دیکھ کر لوکیشو کے شاہکار "حُسن اور حیوان" کا تصور آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ گوماں کی وہ نشیلی نگاہیں پنڈت جی کے رُخِ صحرائی پر ابرِ رحمت بن کر برستی ہیں، وہ اپنے آپ کو ان نگاہوں کی لامتناہی وسعتوں میں کھو دیتے ہیں اور اکثر بالکل بیخود ہو کر شام کو جھومتے ہوئے واپس گھر آتے ہیں۔

ایک شام کا ذکر ہے، میں آتشدان کے قریب، شفق سے گلرنگ ہو گئے تھے۔ جلتی ہوئی لکڑیاں چٹخ چٹخ کر مجھے لوری دے رہی تھیں اور قریب تھا کہ میں یہ دلفریب لوری سنتا سنتا ان کی آغوش میں گر جاتا، اگر باہر کسی قدموں کی آہٹ نے نہ چونکا دیا ہوتا۔ مڑ کر دیکھتا ہوں کہ پنڈت جی شانے سیکڑے چہرے کو اپنے پرانے اوورکوٹ کے اُٹھے ہوئے کالروں میں چھپائے کھڑے ہیں۔

"کیا بات ہے پنڈت جی؟"

جواب ندارد

"چپ کیوں ہو گئے؟ کیا اُداس ہو؟"

کامل سکوت

"کہیں بے بھاؤ کی تو نہیں پڑ رہیں، دوست

کوٹ کے اُلٹے ہوئے کالروں سے ایک قہقہہ بلند ہوا، سکڑے ہوئے شانے سیدھے ہو گئے اور خمیدہ گردن نے اپنے آپ کو اونچا کیا، میں چہرہ دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ یہ گوماں تھی ——— ہنس رہی تھی اور ہنستی ہوئی دوہری ہوتی جا رہی تھی۔

میں جلدی سے ٹانگیں جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور فرطِ حیرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ کچھ توقف کے بعد میں نے گوماں سے پوچھا: "آپ یہاں کیونکر آئیں؟ ———

پنڈت جی کہاں ہیں؟"

"نالے میں پڑے آپ کی راہ تک رہے ہیں۔"

"ہائیں" میں نے گھبرا کر کہا "کیا ہوا، کہیں ———

وہ جلدی سے قطع کلام کر کے بولی۔ لیکن اب اُس کی دلکش ہنسی غائب ہو چکی تھی۔

"ہونا کیا تھا، خاک" اُس نے تیز تر لہجہ میں کہنا شروع کیا۔ "وہ آپکا دوست پنڈت جی، پنڈت جی! ——— بدمعاش کہیں کا...... لچا...... مگر نہیں" اک دم اس کا لہجہ بدل گیا اور وہ تاسف انگیز لہجہ میں بولی "یہ سب میرا ہی قصور ہے۔"

کچھ دیر چپ چاپ سر جھکائے کھڑی رہی۔ پھر اُس نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ بولی "بھائی میں اسے کچھ اور ہی سمجھے ہوئے تھی۔ دینا کچھ کہیے میری نظروں میں وہ میرا بھائی تھا۔ میں نے اُس کے لئے خاوند کی گھرکیاں سہیں، رشتہ داروں کے طعنے برداشت کئے۔ مگر اِس سے غیروں کا سا سلوک نہ کیا۔ آج اِس کا صلہ یہ ملا۔ کہ اُس نے پکڑ کر میرا منہ چوم لیا۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ میں" یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔ اور اسی طرح روتے ہوئے اُس نے پنڈت جی کا اوور کوٹ اُتار کر مجھے دیدیا اور وہ اسی طرح سسکیاں بھرتی ہوئی رخصت ہو گئی۔

"اور اُس کمبخت نے میرے بال نوچ ڈالے" پنڈت جی آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔ اور میں اُن کے پیٹ پر مالش کر رہا تھا۔ میں تو بھلا شرابی تھا، نشے میں چور تھا۔۔۔۔ اب وہ لُشہ کدھر ہرن ہو گیا تھا۔۔۔۔ مگر اُس نے میرا قطعاً" کوئی خیال نہ کیا۔۔۔۔ اُس نے مجھے گالیاں دیں، میرا اوور کوٹ اُتار لیا، اور مجھے کان سے پکڑ کر نالے پر لے آئی، بارش بھی ہو رہی تھی، کمبخت، آہ بند بند دکھ رہا ہے۔ اِس نے میری رتی بھر پرواہ نہیں کی، آہ وہ پھلوں کے ٹوکرے دودھ کے کلسے، مکھن کے گولے"!

میں اُن کی دلچسپ باتیں سن رہا تھا۔ اور خوش ہو رہا تھا۔ میرے کانوں میں کے اسی، ڈے کا وہ ریکارڈ گونج رہا تھا۔۔۔۔ دل لگانے کا نتیجہ مل گیا"!

ان کے کوچہ میں جو تو اے دل گیا
دل لگانے کا نتیجہ مل گیا۔

دل اکثر اداس رہتا ہے، پنڈت جی نے اپنی رونی صورت کو دو آتشہ کر لیا ہے۔ دوستوں سے بے رُخی، نوکروں سے خفگی اور مریضوں سے بے اعتنائی

اختیار کر لی ہے - بات بات پر غصہ - بات بات پر ناراض، وجہ؟ صلح کی سب کوششیں ناکام رہی ہیں - دودھ کے ڈولی لوٹا دیئے گئے ہیں پھلوں کے ٹوکرے بغیر ہاتھ لگائے واپس بھجوا دیئے گئے ہیں - مکھن ایک بال نکالے بغیر پھیر دیا گیا ہے - کریں تو کیا کریں - قریب کے ایک گاؤں کا نمبردار نور حسن اپنی خوبصورت گابھن گائے کو لے آیا کہنے لگا " پنڈت جی اسے جربھٹے، شاید سردی لگ گئی ہے بدن کانپتا ہے نتھنوں سے رطوبت جاری ہے - کبھی کبھی کھانستی بھی ہے اور پچھلا اپنا پاؤں بار بار اٹھاتی ہے، پنڈت جی کوئی اچھی سی دوا دو ابھی ایک مہینہ ہوا اسے کنتھاڈر سے لایا ہوں - آپ کا بھلا ہوگا" پنڈت جی جلے بھنے اٹھے - جلدی سے ایک شیشی اٹھا لائے، گائے کا منہ کھول کر اور پیک چڑھا کر دو انڈیل دی - یا ناریتا اگیو مکسچر جلدی میں پلا گئے ٹینکچر آئیوڈین - گائے نے راستے میں ہی پران دیدیئے - نور حسن کو شبہ ہوا - گابھن گائے، خوبصورت گائے نئی خریدی ہوئی - نا گوری نسل تھانے میں رپٹ لکھوادی -

شومئی قسمت پنڈت جی کو تو خود ہی اس گئو ہتیا کا بہت افسوس تھا، اس پر پولیس والوں نے تنگ کرنا شروع کیا - اصل میں یہ "تھانے والے" دوسروں کے جذبات اور احساسات سے قطعاً بے پرواہ ہوتے ہیں کبھی بھولے سے بھی اُن کے دل میں یہ خیال ہی نہیں گذرتا کہ وہ اپنے طرزِ عمل سے دوسروں کے نازک جذبات کو کتنی ٹھیس پہنچا رہے ہیں - پنڈت جی کو دیکھو بے چارے آپ ہی آپ شرم کے مارے مرے جا رہے ہیں، اب بھلا پولیس کو دخل در معقولات کی کیا ضرورت تھی - گائے تو نور حسن کی مری یا ماری گئی، بھلا یہ تھانیدار صاحب کیوں پرائے پھٹے میں ٹانگ اڑاتے ہیں - اور ہمارے اِن کے تعلقات کتنے برسوں سے خوشگوار چلے آ رہے ہیں - جبکہ یہ تھانیدار صاحب

ابھی سرینگر میں سارجنٹ ہی ہوا کرتے تھے۔ خود میں نے کئی دفعہ ان کی بھینس کی مرہم پٹی کی ہے۔ کہ جب سکول کے لونڈوں نے اُسے پتھر مار مار کر ادھموا کر دیا تھا۔ اور آج یہ ہم سے تین سو روپیہ رشوت میں مانگتے ہیں۔ اور طرفہ یہ کہ دھمکی دیتے ہیں جیل پہنچانے کی حوالات کی، کیوں" یہ کہہ کر پنڈت جی میری طرف تکنے لگے، میں نے نگاہیں نیچی کر لیں، اور بوٹ کی نوک سے زمین کریدنے لگا۔ گویا تین سو روپے وہیں گڑے ہوئے تھے ـــــ اور بھلا کرتا بھی کیا۔ تین سو روپیہ کہاں سے لاتا، پنڈت جی نے تو کبھی پھوٹی پائی بھی نہ دکھی تھی۔ تنخواہ اور بالائی آمدن کے علاوہ ہمیشہ ادھار مانگ کر کھایا کرتے تھے۔ زیادہ نہیں تو کم از کم ساڑھے تین چار سو تک انہیں قصبہ کے دکانداروں کا دینا تھا۔ اور اُن سے اب کچھ مزید ملنے کی توقع نہ تھی ـــــ میں غریب آدمی ٹھہرا ادھر اُدھر سے مانگ تانگ کر پچاس روپیہ اکٹھے کئے۔ مگر یہ تو آٹے میں نمک کے برابر بھی نہ تھا۔ تھانیدار صاحب حرص و آز کے دانت تیز کئے ہوئے تھے تین سو سے ایک پائی کم لینے کو تیار نہ تھے۔ بڑی مشکل کا سامنا تھا اسی شش و پنج میں کئی دن گذر گئے، آخر ایک دن تھانیدار صاحب میرے پاس آئے، کہنے لگے، "کیوں بھئی پھر کیا صلاح ہے۔ چالان کر دوں۔ اور کب تک چپ بیٹھا رہونگا، نور حسن بھی بگڑا ہوا ہے، فرض کی بجا آوری تم جانتے ہی ہو"

قرائن سے معلوم ہوتا تھا، کہ نور حسن نے آج تھانیدار صاحب کی مٹھی گرم کی تھی، فرض کی بجا آوری اتنے دن خاموش رہنے کے بعد آج پھر چمک اُٹھی تھی۔

کوئی جواب نہ پا کر تھانیدار صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے، "اچھا تو چلتا ہوں اگر آج شام تک کچھ بن جائے تو بہتر ورنہ کل تو معاملہ میرے اختیار سے باہر

ہوگا۔

پنڈت جی کو ساتھ لئے رات کے بارہ بجے تک، دربار گھوما۔ کسی نے آس بندھائی۔ رات ساری جاگتے کٹی۔ اور صبح میلے کچیلے بادلوں کا لبادہ اوڑھے نمودار ہوئی۔ رات کو یہ خبر قصبہ میں آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ کہ پنڈت جی کو صبح گرفتار کیا جائے گا۔ صبح لوگ جوق در جوق آنے شروع ہوئے۔ ٹولیاں بنا کر دو دو چار چار کھڑے تھے۔ کوئی کچھ کہتا، کوئی کچھ، کوئی پنڈت جی کی "گئو ہتیا" پر نفرین کرتا۔ تو کوئی تھانیدار صاحب کی روپہلی مصلحتوں کا تذکرہ کرتا، جتنے منہ اتنی باتیں۔ گھر کے اندر پنڈت جی چپ چاپ بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ جب چاروں طرف سے نا امیدی نے گھیر لیا ہو۔ اندھیرے میں کہیں بھی شعاع اُمید نہ دکھائی دیتی ہو۔ اِس وقت طبیعت میں آپ سے آپ سکون پیدا ہو جاتا ہے قلب میں دلیری اور ہر مشکل کا سامنا کرنے کی جرات پیدا ہو جاتی ہے۔ پنڈت جی تو یوں بھی بے پروا، بے فکر نتائج و عواقب سے بے نیاز، طبیعت کے مالک تھے۔ جو کچھ ہوگا دیکھ جائیگا، صبر کر کے بیٹھ رہے۔ تھانیدار صاحب کی راہ دیکھ رہے تھے۔ کہ آئیں تو کم از کم مغلظات سنا کر ہی اپنے دل کی بھڑاس نکال لیں۔

یکایک کسی کے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی اور باہر لوگوں کی چہ میگوئیاں بھی یکایک بند ہو گئیں، میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ یہ تھانیدار صاحب تھے وردی پہنے ہوئے دندناتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ ان کے بعد پولیس کے تین سپاہی اور اُنکے بعد بیس پچیس ہمارے قصبہ کے بھائی بند۔ تھانیدار صاحب نے ایک اُڑتی ہوئی نگاہ سے میری طرف دیکھا اور ــــ سب کچھ سمجھ گئے میں نے انہیں اندر لیجا کر تخلیہ میں بات چیت کی، گڑگڑایا، پنڈت جی نے اُن کے پاؤں بھی پکڑ لئے، مگر وہ خدا کا بندہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ پچاس روپے میں

وہ معاملہ کیسے دبا سکتا تھا۔ اکیلا نور حسن ہی بمشکل ڈیڑھ دو سو بیگہ۔ راضی ہو گا، مقدمہ بالکل صاف تھا۔ گواہ موجود تھے۔ تھانیدار صاحب کو خود بہت رنج تھا۔ کیا وہ پنڈت جی کی گرفتاری کو پسند کرتے تھے؟ ہاں وہ اتنا کر سکتے تھے کہ پنڈت جی کو ہتھکڑی لگائے بغیر گرفتار کرتے۔

جب تھانیدار صاحب اپنا منشا ظاہر کر چکے۔ تو پنڈت جی نے اُٹھ کر اپنا اوورکوٹ اوڑھا اور نگاہیں نیچی کر کے بولے "چلیئے، جدھر چلو، چلتا ہوں۔" میرا دل بھر آیا۔ پنڈت جی لاکھ بُرے سہی، پھر بھی میرے دوست تھے بس چلتا، تو اس کمبخت تھانیدار کی بوٹی بوٹی نوچ لیتا۔ مگر کیا کرتا، اپنے بس کی بات نہ تھی۔ زہر کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ پنڈت جی چلے، آگے آگے تھانیدار صاحب تھے۔ اِس کے بعد پنڈت جی سر جھکائے ہوئے اِن کے بعد پولیس کے سپاہی لوگ آنگن میں کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ اہلِ قصبہ میں ایسا کون شخص تھا۔ جس کے مال مویشی کی خدمت پنڈت جی نے نہ کی تھی۔ اُس آنگن میں بلدیو رام شاہ بھی کھڑے تھے۔ اور گھسیٹا مل بھی، چودھری پیر بخش بھی تھے۔ اور ملک سردار خاں بھی، مگر کسی کو ترس نہ آیا۔ نہ خوفِ خدا سب اہلِ تماشا بنے کھڑے تھے۔ تھانیدار صاحب ابھی بمشکل آنگن میں چار قدم چلے ہونگے۔ کہ دروازے پر کسی نے روک لیا اور کسی کی مہین آواز سنائی دی، "ٹھہریئے"

مجھے کسی کی میلی کچیلی ساڑھی کا پلّو نظر آیا۔ آگے بڑھ کر دیکھا، گومتی تھی سمٹی جا رہی تھی، تھانیدار صاحب ایک طرف ہو گئے۔

گومتی نے پنڈت جی کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے "صُمٌ بُکمٌ کھڑے تھے پھر اُس نے میری طرف دیکھا اور آنکھیں جھکا کر بولی، "بھائی ـــــ میرے

بھائی میرے بھائی کو چھڑا دو" یہ کہکر اُس نے آہستہ سے ایک روپوں سے بھری ہوئی تھیلی میری طرف بڑھا دی۔

"بھائی ـــ میرے بھائی کو چھڑا دو۔

گومتی کے اِس جملے نے پنڈت جی کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا، انہوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے روپے لینے سے روک دیا۔ اور آگے بڑھ کر گومتی کے پاؤں چھو لئے، اور نمناک لہجہ میں بولے، "بس بہن تمہارے روپے مجھے پہنچ گئے۔ میں قید سے آزاد ہو گیا ـــ" پھر تھانیدار صاحب کی طرف دیکھ کر پُرجوش آواز میں بولے، چلو اب دیر کیوں لگا رکھی ہے۔

پنڈت جی چھ مہینے سے جیل میں ہیں، وہاں افیم ملتی ہے نہ شراب۔ خوب مزے میں ہیں۔ کہتے ہیں گومان نے مجھے سدھار دیا۔

مصوّر کی محبت

دھرمسال

۲۰ ستمبر

میری کملا

کتنی مختصر سی بات تھی۔ جسے تم نے افسانہ بنا دیا۔ میری نگاہوں میں تم آج بھی وہی ہو جو سوشیلا کے آنے سے پہلے تھیں۔ میرے لئے پہلے کی طرح ہی دلکشی و جاذبیت کا کامل ترین حسین مجسمہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں۔ کہ میری محبت میں کوئی فرق نہیں آیا، وہ پہلے کی طرح ہی پرجوش اور ہیجان انگیز ہے، اور اس میں تمہاری دوری نے اور یاد نے کرب کا اضافہ کر دیا ہے۔ زندگی کے ان چند خوش آئند لمحات کو جو میں نے تمہارے قرب میں بسر کئے۔ اپنا سرمایہ حیات سمجھتا ہوں، انہیں بھلا کیسے سکتا ہوں؟ تمہیں بھلا دینا — تم جو کہ ان لمحات کا سرچشمہ و منبع ہو ایک ناممکن امر ہے۔

اور پھر — سوشیلا؟ — میں حیران ہوں۔ تم نے سوشیلا کا نام کیوں لیا کیا یہ سچ ہے کہ عورت جوشِ رقابت میں عقل و حواس بھی کھو بیٹھتی ہے؟ اور پھر اس رقابت کا علاج کیا ہے؟ آخر تم نے میری محبت کو "بھالو" (ہربنس کور) سے کیوں نہیں منسوب کیا۔ وہ بھی تو سوشیلا کی طرح موٹی ہے اور اتنی ہی کند ذہن، اور تمہارے ہوسٹل میں وہ جو خوبصورت دھوبن آتی ہے۔ کیا نام ہے اُس کا؟ — نورن؟ — ہاں — ہاں! وہی نورن — جسے دیکھ کر آدمی چغتائی کی پرکیف تصویریں بھی بھول جاتا ہے۔ تم نے اُس کا نام

کیوں نہ لیا۔ تم جانتی ہو فنی نقطۂ نگاہ سے میں اِس کا کتنا پرستار ہوں، اگر تم اِس کا نام ہی سمجھتیں تو مجھے رنج نہ ہوتا۔ بنگال کے سرتاج شاعر چنیڈی داس کو ایک دھوبن سے عشق تھا۔ میں تو خیر ایک معمولی مصوّر ہوں جس کا شاہکار یہ ہے کہ اِس نے اپنے دل کے قرطاس پر تمہاری تصویر کھینچ لی ہے، اجنتا کے رنگین نقوش کچھ مٹ چکے ہیں کچھ مٹ جائیں گے، مگر میری موت ہی شاید تمہاری صورت کو میرے دل سے مٹا سکے۔ "شاید" اِس لئے کہ موت کے بعد کا مجھے علم نہیں!

اِس اعتراف محبت کے بعد تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں، کہ اگر میں نے شو شیلا کو خط لکھ دیا تو کیا بُرا کیا۔ کیا کسی کے خط کا جواب دینا گناہ ہے، ممکن ہے کہ تمہاری اصطلاح میں ایسا ہو، مگر میں حسین نہیں اور نہ تمہاری طرح تشکر و ترحم کے جذبات سے بے نیازی ہی۔ اور اگر سو شیلا نے اپنے خط کے ہمراہ اپنی تصویر بھی بھیجدی تو غالباً اُس کا یہ مدعا ہرگز نہ تھا۔ کہ تمہارے سینہ میں حسد کی آگ مشتعل ہو جائے۔ غالباً وہ صرف اتنا چاہتی ہے۔ کہ میں اُسے یاد رکھوں۔ شاید اسے مجھ سے محض افلاطونی محبت ہے اور یہ کوئی اتنا بُرا جذبہ نہیں۔ جتنا تم اِسے سمجھتی ہو۔ شیلے کو غور سے پڑھو۔ اِس کی شاعری "محبت میں افلاطونیت کی بہترین مثال ہے۔ شیلے کی شاعری بھی اِسی افلاطونی محبت کے طفیل زندہ ہے۔ شیلے کو غور سے پڑھو۔ ورنہ ایم۔ اے میں فیل ہو جاؤ گی، محبت تو الگ رہا۔

اور کیا لکھوں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ خط پڑھنے کے بعد تم مجھ سے روٹھ جاؤ گی۔ مگر مجھے تم سے وہ لازوال بے پایاں محبت ہے کہ میں تمہارے روٹھ جانے کی ذرہ بھر بھی پرداہ نہیں کر سکتا۔ عمر خیام کے بعد دُنیا میں اگر کوئی

دوسرا فتور جو پیدا ہوا ہے تو وہ میں یہاں ابتر ہو گا۔ کہ مجھ سے روکنے کی
صلاح نہ کرو۔ بہترین بات یہ ہوگی کہ رقابت کو دل میں جگہ نہ دو۔ میں تمہیں
مناؤنگا بھی نہیں اور میں اپنا دل جلاوگی۔
میں یہاں جھیل پر مچھلی شکار کر کے اور لمبی لمبی سیریں کر کے اپنے دن گزار
رہا ہوں۔ میری صحت پہلے سے بہت اچھی ہے، مگر میں اس وقت تک تمہارے
پاس مسوری آنے کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔ جب تک کامل طور پر صحت یاب
نہ ہو کہ اختلاج قلب کے لئے قرب محبوب موافق نہیں
تورن کی تصویر قریب قریب مکمل ہو چکی ہے۔ افسوس ہے کہ ڈاک میں
یہ تصویر تمہیں نہیں بھیج سکتا۔ ورنہ تمہاری ناقدانہ رائے سے بھی فائدہ اُٹھا لیتا
اِس کے بعد میں بگی کی تصویر کو شروع کرونگا۔ بگی کون ہے میں اِس دلچسپ
ہستی کے متعلق اگلے خط میں لکھوں گا۔ فی الحال یہی لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں
کہ بگی ایک عورت ہے۔

تمہارا :۔ شیام سندر ۔

دھرمسال

۱۸ر اکتوبر

میری بیوقوف کملا

کہتے ہیں حسن کو عقل سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ اسی لئے میں نے تمہیں
بیوقوف لکھا۔ یوں تو تم اپنے کو ایم۔ اے میں پڑھتی ہو۔ مگر اِس امر سے تمہاری عقل
کو کچھ سروکار نہیں۔ یہ سب ہمارے طریقہ تعلیم و نصاب تعلیم کی خامکاریاں
ہیں۔ ورنہ یہ ممکن نہ تھا۔ کہ تم جیسی ہم تن دوشیزائیں کالجوں میں لڑکوں کے

دوش بدوش پڑھتیں اور مارشل اور مارکس کے معاشی نظریوں کی اس جاہلانہ انداز میں تنقید و تنقیص کرتیں۔ چھوڑ دو خدارا ان نظریوں کو۔ ان میں کیا پڑا ہے؟ آج تک کوئی عورت اقتصادیات و معاشیات کی ماہر نہیں بن سکی۔ یہ کرخت مسائل صنف کرخت ہی کے لئے رہنے دو۔ ان معاشی و اقتصادی فلسفوں میں اُلجھ کر تمہاری والہیت، رنگینی، معصومیت سب فنا ہو جائیں گی اور اس وقت دُنیا کو انہی چیزوں کی بڑی ضرورت ہے۔ یہ سب نظریے تمہارے لئے بنائے گئے ہیں۔ نہ کہ تم اُن کے لئے۔ تم کو کم از کم میرے جذبات و حسّیات کا احترام کرنا چاہیئے۔ میں مصوّر ہوں، حسن سرکش، حسن بے باک کو پسند کرتا ہوں۔ مگر وہ حسن جو محتاج ہو عینک کا مجھے کسی حالت میں گوارا نہیں۔ شیلے کو پڑھو۔ شیلے اپنی شاعری کے بعض لمحات میں دنیا کا سب سے بڑا شاعر نظر آتا ہے۔ آج بے وقوف گاڈون کو کون پوچھتا ہے، اُس کا نام محض شیلے کے نام سے زندہ ہے۔ کیونکہ وہ شیلے کا استاد تھا۔ یا یوں کہو کہ شیلے اُسے اپنا اُستاد سمجھتا تھا۔ گاڈون کے پاس دو چیزیں تھیں۔ ایک اُس کا اشتراکی مسئلہ دوسری اس کی لڑکی مری۔ شیلے نے میری کو پسند کر لیا۔ اسی میں اُس کی عظمت پنہاں ہے، تمہارے سامنے دو چیزیں ہیں۔ ایک طرف ہیں ریکارڈو کے نظریات اور دوسری طرف محبت۔ وہ والہانہ محبت جو قیود مذہب و ملت سے بیگانہ ہے ان تمام نظریوں اور الجھنوں سے ناآشنا ہے وہ محبت جو ایک فرد کو دوسرے فرد واحد سے ہوسکتی ہے۔ اور جس میں اشتراک کا شائبہ تک بھی نہیں۔ اپنی عظمت کو پہچان لو۔

میں نے بگی کی تصویر بنانی شروع کر دی ہے۔ بگی ایک گوالن ہے نہایت خوبصورت اور نہایت ہی بیوقوف۔ کل میں نے جھیل کے کنارے بٹھا کر اسے

تمہارا خط پڑھا کر سمجھایا اور میں یہ دیکھ کر بڑا حیران ہوا ۔ کہ اُسے رکارڈو کے نظریہ کے مطابق پروا نہیں اور نہ وہ اسے تمہاری طرح عورتوں کا مبگنا کارنامہ ہی تصور کرتی ہے ۔ وہ مجھ سے شادی کی خواہاں ہے ۔ وہ چاہتی ہے کہ اُس کے نو دس بچے ہوں ۔ بیوقوف لڑکی ! وہ جرمنی یا اٹلی میں پیدا ہوتی تو شاید اُس کے نصیب کھل جاتے ۔ کیا عجب ہٹلر یا مسولینی اُس سے شادی کرلیتا ۔ اور مجھے یہ لکھتے ہوئے بہت افسوس ہوتا ہے کہ اُسے انتا بھی نہیں کہ سلجمین کے نظریہ محصولیات میں کیا کیا خامیاں ہیں اور ہنٹر صاحب نے اُنہیں کس خوبی سے رد کیا ہے ۔ ہاں اُس کے بال بہت خوبصورت ہیں سونے کے باریک تاروں کیطرح نرم و نازک اور وہ آتشیں اس طرح اُلجھے ہوئے کہ گمان ہوتا ہے ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں ان گیسوؤں میں آکر بند ہو گئی ہیں ۔ شام کے وقت جب میں بنسی کی ڈور ہاتھ میں لئے جھیل کے کنارے بیٹھا ہوں اور جب شفق کی ارغوانی روشنی جھیل کے نیلے پانی سے کھیلتی ہے اس وقت وہ خوبصورت گوالن ایک ننھا سا بھیڑ کا بچہ گود میں لئے مدہم سروں میں گاتی ہے ؎

مینوں دس کھاں نی ماۓ

کدوں گھر آوسی ماہیا   لیسی گلے نال لا ماہیا

مینوں دس کھاں نی ملۓ   مینوں دس کھاں نی ماۓ

بگی کی آواز میں لوچ ہے ۔ اور درد بھلا اور پھر یہ انتہا شیرینی ۔ میں نے اُس سے پوچھا "وہ بگی ! تم نے کون سے میوزک اسکول میں تعلیم پائی ہے" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔ کہنے لگی "میوزک اسکول کیا ہوتا ہے" میں نے کہا "جہاں یہ گیت سکھائے جاتے ہیں ۔ گانا اور سروں کا اتار چڑھاؤ"

وہ بولی اور اب اس کی آنکھیں ایک لمحہ کے لئے خوابیدہ سی ہو گئیں "خیر نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟ تو آگے سنو"

اسمانیں اُڈّی اِل ماہیا   میرا تیرے اُتے دل ماہیا
ہُن آ ہُن آ۔ ماہیا   گل نال لا۔ نال لا۔ ماہیا
مینوں دس کھاں نی مائے

کتنا دلفریب نغمہ تھا۔ اور کتنا پُر اثر جادو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پانی کا ہر قطرہ اور پانی پر جھکی ہوئی ٹہنی کا ہر پتہ ترنم خیز ہے یا ہر ذرّہ کائنات گوالن بن گیا تھا اور میٹھے میٹھے سروں میں گا رہا تھا۔

مینوں دس کھاں نی مائے   مینوں دس کھاں نی مائے

کرشن جی کی بنسی شاید انہی گوالنوں میں گونجی تھی اور رادھا جی بھی شاید کوئی ایسی گوالن ہونگی۔ اگر رادھا جی آج زندہ ہوتیں۔ تو خدا جانے ٹیرف بورڈ کی موجودہ سفارشات کے متعلق اِن کی کیا رائے ہوتی؟ دلچسپ سوال ہے اور تم جیسی ماہر اقتصادیات کے ذکر رسا کے لئے نہایت موزوں مجھے اُمید ہے۔ کہ میری محبوبہ اپنے خط میں ضرور اِس دلچسپ سوال پر روشنی ڈالے گی۔

منجھلے بھائی اترسوں لاہور روانہ ہو گئے ہیں۔ انہیں ایف۔ اے کے ضمنی امتحان میں بیٹھنا ہے۔ وہ مسوری میں ضرور تم سے ملیں گے۔ نورن کی تصویر اُن کے حوالے کر دی گئی ہے۔ سنبھال کر رکھنا۔ فیروز بھائی ابھی تو لاہور کی لستیوں میں گرمائی ٹینس ٹورنمنٹ کھیل رہے ہیں یا مسوری پہنچ گئے ہیں؟

تمہارا۔ شیام سندر

دھرمسالہ

۱۲ اکتوبر

کملا!

معلوم ہوتا ہے۔ کہ بخت کی نامساعدت ابھی میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی اختلاجِ قلب کا دورہ پچھلے چند دنوں سے پھر تیز ہو گیا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔ چند دنوں میں صحت یاب ہو کر تمہارے پاس پہنچ جائیگا۔ مگر شاید قسمت کو کچھ اور ہی منظور ہے۔

اچھا تو کالج کھل گئے ہیں۔ یہ تم نے نئی بات بتائی۔ ورنہ مجھ ایسے گنوار کو بھلا کب اِس بات کا پتہ چلتا۔ میں نے مزید ایک مہینہ کے لئے چھٹی کی درخواست کالج میں بھیج دی ہے۔ فیروز بھائی کے خط سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اب تمہاری اور سوشیلا کی آپس میں گہری چھنتی ہے کلاس روم میں بھی دونوں سہیلیاں ہمیشہ اکٹھی بیٹھتی ہیں اور ریفرشمنٹ روم میں بھی اکٹھے جانا ہوتا ہے۔ بانہ میں بازو ڈالکر۔ میں نہ کہتا تھا۔ کہ سوشیلا بدذات اچھی لڑکی ہے گو اِس کی ناک بہت چھوٹی ہے۔ مگر اِس کا دل اتنا فراخ ہے کہ بیک وقت اِس میں چار عاشق اور قریب قریب اتنی ہی سہیلیاں سما سکتی ہیں۔ میں اِس بہناپے پر بہت خوش ہوں، اور اِس بات کی امید بھی ہوں کہ تم بھی میرے اوریگی کے رشتہ محبت کو خلوص کی نظروں سے دیکھ سکو "نورن" تمہیں پسند آئی ہے مگر "نورن" کسے پسند نہیں۔ سیدھا

نے بھی اپنے خط میں شاباش کے لڈو بھیجے ہیں، لکھتے ہیں کہ "امسال کالجیٹ آرٹ سوسائٹی کی سالانہ نمائش پر تمہاری نورن کی تصویر کی بھی نمائش کریں گے" ہزار ہزار شکریہ، مگر میں یہ جاننے کے لئے بے چین ہوں کہ خود نورن کی اپنی تصویر کے متعلق کیا رائے ہے؟ تم نے اُسے یہ تصویر تو دکھائی ہوگی؟

میں نے شروع میں بگی کی تصویر کا ہلکا سا خاکہ تیار کرنا چاہا تھا۔ مگر مجھے اِس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ اصل بات تو یہ ہے کہ میرے ہاتھ اِسکی تصویر پر جمتے ہی نہیں۔ پتہ نہیں کیوں؟ جوں جوں بگی کو دیکھتا ہوں مجھے اُس کے متعلق نئی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ بظاہر نہایت خفیف لیکن باطن میں نہایت نمایاں، دل کی گہرائیوں تک پہنچی ہوئی، وہ ایک ایسا جواہر پارہ ہے کہ جس کے ہر گوشے سے اور ہر پہلو سے ایک نئی شعاع کا انعکاس ہوتا ہے میں جب تک اِس کے دل کی مختلف کیفیتوں اور نیرنگیوں کو نہ پالوں اِس کی تصویر کو کیسے شروع کر سکتا ہوں، ممکن ہے کہ تمہیں مونالیزا کی تصویر اِس موقع پر یاد آجائے۔ مگر میرے خیال میں اطالوی مصوّر نے مونا کے دل کی گہرائیوں کو پالیا تھا۔ ورنہ ناممکن تھا۔ کہ وہ ایسا بلند پایہ صوری شاہکار آرٹ کی دنیا میں پیش کر سکتا، مصوّر اور ممول کے درمیان ایک نازک بے معرفہ کا ناتا میرے کس کام آئے گی، میں جو ہر شے کے صوری پہلوؤں پر نظر ڈالنے کا عادی ہوں۔ آج اِس کرب انگیز حقیقت کا احساس کر رہا ہوں کہ دُنیا میں سچّی خوشی کی بنیاد ظاہری نہیں۔ بلکہ محض نفسیاتی اور جذباتی ہے ورنہ نہ ناممکن تھا۔ کہ مجھ جیسی قنوطیت پسند طبیعت پر بگی کی موت کا اتنا اثر ہوتا اور

وہی دلفریب قدرتی مناظر جو ایک ہفتہ پہلے میری روح کو بالیدگی بخشتے تھے اب یوں مجھ پر خندہ زن ہوتے، پرسوں سے پھر برف باری جاری ہے اور میں سامنے کے بند دریچے کے شیشوں میں سے اِن برف کے گالوں کو دیکھ سکتا ہوں جو چپ چاپ کسی بیکس کے آنسوؤں کی طرح زمین پر گر رہے ہیں، کل دنیا اس سپید خموشی کے لبادے میں لپٹی ہے، پرندے بھی خاموش ہیں، ہوا بھی ساکن ہے اور چاروں طرف موت کا سکوت چھایا ہوا ہے — مگر میرے دل میں اک قیامت خیز ہیجان بپا ہے۔

آج سے ٹھیک دس روز پیشتر بھی اسی طرح برفباری شروع ہوئی تھی لیکن آج اور اُس دن میں کتنا فرق ہے!

میں اس روز جھیل میں ایک ہلکی سی ناؤ کو کھے رہا تھا، آسمان بالکل صاف تھا۔ جھیل کے پانی کی طرح نیلا، اور مغربی شفق سے رنگین، میں ناؤ چلا رہا تھا اور ایک مبہم خوشی کے زیر اثر ایک بے معنی پہاڑی گیت گا رہا تھا۔ جھیل کے اُس پار بکریاں ریوڑ چرا رہی تھی۔ اور مجھے اُس کے کاندھے پر رکھی ہوئی لاٹھی اور تار تار عنکبوت کی طرح چمکتے ہوئے بال صاف نظر آ رہے تھے۔

اتنے میں زور کا جھکڑ چلنے لگا، آسمان پر کالے کالے بادل اُٹھے۔ ہوا میں تیزی اور خنکی آ گئی اور جھیل کا پانی لہریں مارنے لگا۔ میں نے بھی زور زور سے کھینا شروع کر دیا۔ اور ناؤ کو جلدی سے پار لگانے کی کوشش کی، بمشکل کنارے پر پہنچا تو بوندا باندی اور پھر ساتھ ہی تڑا تڑ اولے بھی برسنے شروع ہو گئے۔ بہزار خرابی کشتی کو کنارے پر گھسیٹ کر ایک جھاڑی سے باندھا اور دور پرے ایک درخت کو دیکھ کر اُس کی طرف بھاگا۔

اولے پڑتے گئے اور میں بھاگتا گیا۔ اپنے سر کو بچانے کے لئے میں اپنا کوٹ اتار کر دونوں بازوؤں سے سر کے اوپر چھاتے کی طرح پھیلا دیا اور بھاگتا گیا، بجلی کی چمک، بادل کی گرج اور ہوا کے بے زمانی فراٹے ہوش وحواس گم کئے دیتے تھے۔ آخر وہ درخت قریب آگیا۔ اور میں ایک جست لگا کر اُس کے تنے سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند کرلیں، اور دل پر ہاتھ رکھا۔ بچارا کتنے زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ ابھی پھوٹ جائیگا۔ ایک طویل عرصہ کے بعد جب سانس کی وہ دھونکنی ڈھیلی پڑی دل ٹھکانے آیا اور حواس بجا ہوئے۔ تب جا کر کہیں میری آنکھیں کھلیں اور میں نے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔

خدا کتنا بڑا سرول درخت تھا۔ صرف تنے کا پیٹ ہی ساٹھ ستر فٹ ہوگا۔ اور کتنا اونچا درخت تھا۔ دور اوپر کہیں سے اولوں کی "تڑا تڑ" کی آواز آرہی تھی۔ مگر اِس گھنے چھتنارے کے نیچے کوئی اولا نہیں گرتا تھا۔ چاروں طرف قیامت کا منظر تھا، لیکن یہ تین سو، چار سو یا شاید پانچ سو سال کا پرانا درخت" ایک پُرشور مہیب بحری طوفان میں ساکن جزیرے کی طرح قائم تھا۔ ایک بے آب وگیاہ ریگستان میں خوشنما لہلہاتے ہوئے نخلستان کی طرح تنہا، قدرت نے ایک ہی جھلک میں کائنات کی تصویر کے دونوں پہلو دکھا دیئے۔"

میں یونہی سوچتا ہوا اپنے بھیگے ہوئے کوٹ کو نچوڑ رہا تھا۔ کہ اتنے میں کہیں پاس ہی سے بکری کے بچے کی "میں میں" سنائی دی۔ معاً گھوم کر اور درخت کے تنے کے دوسری طرف جا کر دیکھتا ہوں۔ کہ تنے میں ایک بڑی سی کھوکھ ہے جس

میں بگی خاموش "صم" "بکم" ایک سونٹے کے سہارے کھڑی ہے اور بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ اس کے پاس ہی قدموں میں بیٹھا ہوا ہے۔

مجھے دیکھ کر بگی ایک دم کانپ اُٹھی۔ اِس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نمودار ہوئی اور پھر آہستہ سے اُس نے اپنا سر نیچا کر لیا۔

میں نے ایک بکری کے بچہ کو آہستہ سے گود میں اُٹھا لیا۔ سردی میں مجھے اس کی نرم نرم ریشم کے گھنے بال نہایت بھلے معلوم ہوئے۔ یونہی اِس بکری کے معصوم بچے کے سر پہ ہاتھ پھیرتے پھیرتے میں نے بگی سے پوچھا۔

"دو دن سے میں نے تمہیں نہیں دیکھا بگی؟"

وہ خاموش رہی، آنکھیں جھکائے ہوئے۔

میں بکری کے بچے سے کھیلتا رہا۔

اب چاروں طرف خاموشی چھا گئی تھی، اولے برسنے بند ہو گئے تھے۔

آخر ایک صدیوں کی طرح لمبے عرصے کے بعد میں نے آہستہ سے کہا "یہاں تو بہت سردی ہے بگیا میں کھوکھ کے اندر آسکتا ہوں؟"

کوئی جواب نہ پا کر میں کھوکھ کے اندر آسکتا ہوں؟

کوئی جواب نہ پا کر میں کھوکھ کے اندر آ گیا۔

"ہونہہ۔ اچھی خاصی کوکھ ہے!" میں نے آپ ہی بلند آواز میں کہنا شروع کیا "پتہ نہیں اس درخت کی عمر کیا ہو گی؟ بگی؟ —— شاید دو تین سو سال ہو گی۔ کیوں بگی؟ ٹھیک ہے نا؟ کتنی اچھی جگہ ہے۔ طوفان اور برف و باراں میں غریب چرواہے اِسی درخت کی کوکھ کا سہارا ڈھونڈتے ہوں گے۔ ٹھیک ہے نا! بولتیں کیوں نہیں؟"

بگی کھلکھلا کر ہنس پڑی، آہ، وہ دلکش ہنسی، اس کے موتیوں کی طرح خوشنما دانت چمک رہے تھے۔ اور اُس کا غنچہ سا دہن اس کو ہستانی گلاب کے پھول کی طرح روشن ہو گیا۔ جس کے درمیان برف رکھ دی گئی ہو۔

میں نے بکرو ٹے کو زمین پر چھوڑتے ہوئے پوچھا "کیوں ہنس رہی ہو بگی؟"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ہنس رہی تھی۔ اور کانپ رہی تھی۔ اس کے بازو ننگے تھے۔ اور اُس کی قمیص جا بجا پھٹی ہوئی تھی۔

"تمہیں سردی لگ جائے گی بگی۔ لو یہ کوٹ پہن لو۔"

اُس نے ہنسنا بند کر دیا اور چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ میں اُسے کوٹ پہنانے لگا۔ جب میں کوٹ پہنا چکا۔ تو اُس نے آہستہ سے اپنے بازو میری گردن میں ڈال دیئے۔ اور اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔ اور سسکیاں لیکر رونے لگی۔

میں اِس کی ہنسی کو نہ سمجھ سکا تھا۔ لیکن اُس کے رونے کو سمجھ گیا، محبت کے پُرسوز نغمے نے یکایک دل کے ویرانے کو روشن کر دیا۔ میں بگی کے پریشان بالوں سے کھیلنے لگا۔ وہ سسکیاں لے کر رو رہی تھی۔ اور اپنی پریشان لٹوں سے آنسوؤں کو پونچھتی جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی سسکیاں کم ہو تی گئیں

ادلے بند ہو چکے تھے۔ اور اب برفباری شروع ہو گئی۔ چاروں طرف دھند اور تاریکی چھا رہی تھی۔ شاید اس اتنی بڑی دنیا میں ایک ہی

سردل کا گھنا چھتنار محفوظ نظر پناہ گاہ تھا۔ اور اسی چھتنارے کے نیچے

کھڑے ۔ دو فرد اور دو دھڑکتے ہوئے دل باہر کے طوفان سے پناہ مانگ رہے تھے ۔

اور ___ اگر اسی کوکھ میں کھڑے کھڑے میت کے ان دو پتنگوں کی عمریں بیت جاتیں تو کیا ہی اچھا ہوتا !

سرول کا چھتنارا، بھیڑ، بکریوں کا ریوڑ، بگی اور میں، اور خوشی کے آنسو یا شاید غم کے آنسو! کون کہہ سکتا ہے ؟ فطرت کس قدر پُر اسرار ہے!

______ اور اُس کے دو دن بعد وہ مر گئی، نہیں، اُس کے وحشی باپ نے اسے مار ڈالا ۔

گیا وہ ایک رات پھر ایک سرول کے درخت کی کوکھ میں ایک اجنبی کے پاس نہ رہی تھی ؟ اُس نے ٹھیک کیا ۔ اُسے مار ڈالا ۔ یہ جنگل کا قانون تھا ۔ اُس نے اس کی لاش کو گھسیٹ کر جھیل کے کنارے برف پر پھینک دیا ۔ شاید میری اپنی آنکھوں نے اسے جھیل کے کنارے برف کے سفید بستر پر سوئے ہوئے دیکھا، کتنی گہری نیند تھی، کبھی نہ ختم ہونے والی، اُس کے بازو کھلے تھے، اُس کے سنہری بال اُلجھے ہوئے، چہرہ کنول کے تھائید؟ پھول کی سپید، اور اس کی کنول کی ڈنڈی کی طرح نازک گردن میں ایک گہرا شگاف تھا ۔ یاقوت کی طرح گہرا سرخ ۔ میں جانتا ہوں کہ میں اُسے اس طرح پڑے دیکھ کر پاگل ہو گیا تھا ۔ میں جانتا ہوں ۔ کہ میں نے اس وقت آگے بڑھ کر اور گھٹنے ٹیک کر اُس گہرے یاقوتی گھاؤ کو چوم لیا تھا ۔ آہ، مگر یہ تو ایک بیوقوف مصور کی فطری کمزوری تھی ۔ وہ اِس ایک بوسے سے اُس سونے کی مورت میں روح پھونکنا چاہتا تھا ۔

بے سود، محض بے سود"

تم کہتے ہو۔ کہ میرا خط پڑھ کر کملا پہروں روتی رہی ہ تمہیں پتہ ہے فیروز، میں ان سات دنوں میں کس قدر رویا ہوں۔ کیا میرے آنسو کملا کے آنسوؤں کی سزائیں، جانے دو فیروز بھائی۔ یہ آنسو کس کام کے ہیں میرے اور کملا کے بے سود، بالکل بیسود۔

پتہ نہیں یہ آنسو کب بند ہوں گے، پتہ نہیں یہ برفباری کب بند ہو گی۔ بہرصورت میں کل ضرور جھیل کے اُس پار جاؤں گا۔ جہاں سرو ل کا ایک گھنا چھتنارا ہے، جس کے تنے میں ایک بڑی کوکھ ہے، جھیل کے کنارے میری کشتی انتظار کر رہی ہو گی اور جھیل کے اِس پار میری بچی!

یہ کون گا رہا ہے۔ سنتے ہو۔ کتنا میٹھا، پُر درد گیت ہے۔

ہن آ، ہن آ، ماہیا گلے نال لا، نال لا ماہیا

بینوں۔۔۔۔۔۔۔۔

روزنامچہ پولیس۔ تھانہ دھرمسال

۸۔ نومبر

آج ڈاک بنگلہ کے چوکیدار مسمی صاحبدین کی رپورٹ پر کالا رام خواندہ کنسٹبل کو جھیل پر بھیجا گیا، ایک ٹوٹی ہوئی کشتی ملی اور پانی میں تیرتی ہوئی ایک لاش چوکیدار مذکور کا بیان ہے کہ اُس نے کل شام متوفی کو آخری مرتبہ دیکھا جبکہ وہ ننگے سر جھیل کی طرف بھاگتا ہوا جا رہا تھا۔ چوکیدار نے کئی بار آوازیں دی۔ مگر متوفی نے کوئی جواب نہ دیا۔ متوفی رات کو واپس

بنگلہ پر نہیں آیا۔

متوفی کے جسم پر کوئی چوٹ یا خراش نہیں، موت غالباً خودکشی سے ہوئی یا اتفاقیہ ڈوب جانے سے، متوفی کا نام شیام سندر تھا وہ لاہور کا رہنے والا تھا اور یہاں بغرض سیر و سیاحت آیا تھا لاش بغرض پوسٹمارٹم سول سرجن صاحب بہادر کو بھیج دی گئی ہے۔ مزید تفتیش جاری ہے۔

بقلم خود

حق نواز خاں صدر محرّر

تھانہ چوکی دھرم سال

"تریاق" یرقان

"یرقان بذاتِ خود کوئی بیماری نہیں" یہ بھی ڈاکٹروں کا ایک مفروضہ ہے سائنسدان کے اِس مفروضہ کی طرح کہ چاند بذاتِ خود روشن نہیں، دراصل اسی قسم کے مفروضوں سے ڈاکٹر اور سائنسدان عامیوں سے الگ پہچانے جا سکتے ہیں۔ اور نہ یہ تو غیر ممکن ہے۔ کہ ہم میں سے کوئی چاند کی ٹھنڈی چاندنی اور یرقان جیسی تکلیف دہ بیماری سے انکار کر سکے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ میری بات پر مطلق یقین نہ کیا جائے۔ اور اُسے محض ایک یرقانی نظریہ قرار دے کر طاقِ نسیاں پر دھر دیا جائے۔

بہرحال آپ کو یاد رکھ لینا چاہیئے۔ کہ یرباق ایک بیماری ہے اور بہت اذیت پسند بصورتِ دیگر آپ کو اِس کہانی کے پڑھتے یا سننے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اِس کہانی کے شروع ہونے پر میں یرقان میں مبتلا تھا۔ جس طرح ساون کے اندھے کو ہر طرف سبزہ ہی سبزہ دکھائی دیتا ہے اسی طرح یرقان میں آدمی کو ہر طرف زردی ہی زردی نظر آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا کسی غیبی ہاتھ نے کل کائنات پر زعفران انڈیل دیا ہو اور بس۔ اِس کے بعد مرض کا ایک اور درجہ ہے، زندگی کی ایک منزل ہے جہاں سب دوئی مٹ جاتی ہے۔ اور مجھ ایسا شریف کنوارا نروانی حاصل کر لیتا ہے۔

بس یہی بیماری اِس مختصر سے قصّہ کی ابتدائی تھی، ان دنوں بیمار پڑتا نہ

شاما میری عیادت کو آتی۔ شاما کے متعلق میں صاف طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں۔ کہ میری محبوبہ ہے۔ یعنی میں اُس سے محبت کرتا ہوں۔ اور وہ اپنے خاوند سے محبت کرتی ہے۔ جو چکوال میں اینٹوں کے ایک بھٹے پر ملازم ہے بیس روپے تنخواہ پاتا ہے۔ اور بھٹے پر کام کرنے والے مزدوروں کی حاضری لگاتا ہے۔ اور کبھی کبھی اپنی حسین بیوی کو خط لکھ دیتا ہے۔ جن میں اکثر سیف الملوک شاہ بہرام اور حسن بانو کے پاکیزہ اشعار درج ہوتے ہیں، شاما وہ خط اکثر مجھ سے پڑھوایا کرتا ہے۔ اُس وقت اُس کا چہرہ شرم سے لال ہو جاتا ہے۔ بچاری اَن پڑھ ہے نا۔ اور جب میں سیف الملوک ملوک، الکلام کی تشریح اپنے مخصوص پیرفانی انداز میں کرتا ہوں تو کس قدر گھبرا جاتی ہے۔ لجاتی ہے اور پیاری معلوم ہوتی ہے۔ گل عارض پر چمک اور آنکھوں میں دمک آجاتی ہے۔ لب کانپتے ہیں۔ اور پھر مجھے یکایک اس کی مہین شیریں آواز سنائی دیتی ہے " آگے کیوں نہیں پڑھتے ؟" اور ...... میں بھلا پڑھتے پڑھتے اِس کے چہرے کی طرف کیوں دیکھنے لگ گیا تھا، محبت ؟ نہیں یہ تمانیت! یا اللہ مجھے محبت ہے کیا ؟

ایک دن ...... وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہے ......

میں بستر پر کروٹ کے بل لیٹا ہوا ریشم کے کیڑوں سے کھیل رہا تھا۔ ہمارے پڑوسی نے ریشم کے کیڑے پالے تھے۔ وہ اِن کے کوئے بیچتا تھا، بڑی اچھی تجارت ہے، پچھلے سال اُس نے دو ماہ کے قلیل عرصے میں کوئے بیچ کر تین سو روپے کمائے تھے۔ میرا چھوٹا بھائی اِس سے آٹھ دس ریشم کے کوئے مانگ لایا تھا۔ اُن کوؤں میں سے پانچ پھوٹ گئے تھے اور ان

میں سے ریشم کے کیڑے نکل آتے تھے، سفید اور زردی مائل کیڑے جو کویوں سے نکل کر نہ کچھ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں۔ صرف سات دن زندہ رہتے ہیں۔ اُس عرصے میں نر و مادہ آپس میں جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں اس کے بعد نر مر جاتا ہے۔ پھر مادہ انڈے دیتی ہے اور وہ باریک اور گول گول، خشخاش کے دانوں جیسے، اِس کے بعد مادہ بھی مر جاتی ہے بس یہی سات دن اُن کی حیاتِ معاشقہ ہیں۔"

میں ان ریشم کے کیڑوں سے کھیل رہا تھا۔ اِن میں چار نر تھے اور ایک مادہ بڑے بڑے زرد پروں والی، جو خاموش بیٹھی نر کیڑوں کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے تک رہی تھی۔ وہ کسے پسند کرے گی۔ کس پر اِس کی نظرِ انتخاب پڑے گی۔ وہ کون خوش نصیب ہو گا۔ جو اِس سیمیں تن حسینہ کا محبوب ہو گا۔ آپ یہ جانئے مقابلہ واقعی سخت تھا۔ نر کیڑے دیوانہ وار بھونروں کی طرح اُس کی طرف اُڑ اُڑ کر چلے جاتے تھے، وہ پروانوں کی طرح شمع کے گرد طواف کرتے تھے، کبھی وہ آپس میں گتھ جاتے، اِس طرح کہ مجھے ان میں سے کسی ایک کی ہلاکت کا شبہ ہو جاتا۔ پھر میں جلدی سے انہیں الگ الگ کر دیتا، وہ کچھ دیر چپ بیٹھے رہتے، بالکل خاموش، بےحس و حرکت مگر جلد ہی وہ حسین مجسمہ انہیں اپنی طرف مائل کر لیتا۔ اور وہ پھر بے اختیار پھر پھڑانے لگتا۔ کبھی ایک کبھی دوسرا اُڑ کر مادہ کے پاس جاتا اور اپنے منہ کو اِس کے منہ کے قریب لا کر نہایت چرب زبانی سے اپنے عشق کا اظہار کرتا، وہ کافر ادا کبھی مسکراتی، کبھی بے اعتنائی سے منہ موڑ کر پرے ہو جاتی۔ نر بچارا اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا۔ . . . . . عورت کی فطرت میں

دوڑی کیوں ہے، ایک ہی نظر سے یہ گھاؤ بھی پیدا کرتی ہے - اور اس پر پھاہا بھی رکھ دیتی ہے - دل تڑپا دیتی ہے اور تسکین بھی پہنچاتی ہے - مرہم بھی اس کو پہنچتا ہے - کرم بھی اس کے شایاں ہے .....

یہی سوچتے سوچتے میں نے آنکھیں بند کر لیں، کسی کے پاؤں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی اور کوئی میرے سرہانے آکر کھڑا ہوا۔

میں نے آنکھیں کھولے بغیر ہی کہا "ماں...... ولیہ لائی ہو؟"

"نہیں، میں ہوں شاما!"

اگر میرے پیٹ پر رکھی ہوئی پانی کی بوتل لڑھک کر پھٹ جاتی تو مجھے اس قدر تعجب نہ ہوتا جس قدر شاما کے آنے پر ہوا - جب سے میں بیمار ہوا تھا - اور مجھے بیمار پڑے تین ماہ ہو چکے تھے - وہ ایک دفعہ بھول کر بھی مجھے پوچھنے نہ آئی تھی - کیا اس کے خاوند کا چکوالی سے خط نہ آیا تھا؟

"شاما، تم؟" میں نے خالص ڈرامائی انداز میں کہا -

"ہاں میں!" اس نے خالص دیہاتی انداز میں جواب دیا، "یہ لو" تمہارے لئے چند ایک خوبانیاں لائی ہوں - خوب پکی ہیں اور میٹھی" یہ کہہ کر اس نے رومال کھول کر سب خوبانیاں میرے بستر پر بکھیر دیں -

یرقان میں مجھے دو چیزیں بہت مرغوب و موافق ہیں - ایک خوبانی دوسری شاماہ اور پھر جب دونوں اکٹھی مل جائیں تو میری خوش قسمتی کے کیا کہنے آج ہی میں واقعی خوش قسمت تھا - میں آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور اخبار کا وہ صفحہ جس پر ریشم کے کیڑے دھرے تھے آہستہ سے پرے رکھ کر کہا"

"آؤ بیٹھو"

وہ پائنتی پر بیٹھ کر بولی "کیا حال ہے؟"

"اچھا ہے"

کچھ دیر ہم دونوں "صم بکم" بیٹھے رہے، میں نہ جانتا تھا۔ کہ مجھے کیا کہنا چاہئیے، دل میں جذبات کا طوفان اُمڈ آیا تھا۔ اپنے غم اور غصے کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا۔ مگر یکایک زبان گنگ ہوگئی، دل میں شکایتوں کا طومار تھا، مگر لب جیسے کسی نے سی دیئے تھے۔ دل میں بےچینی کا طوفان تھا۔ مگر آنکھیں اس کے چہرے کو دیکھ کر مسرور ہوگئیں ۔۔۔۔۔۔۔ آخر سوچ سوچ کر میں نے کہا "چکوال سے کوئی خط آیا؟"

"نہیں تو تم تو بہت ہی نحیف ہوگئے ہو۔ تمہاری آنکھیں اس قدر زرد کیوں ہیں، مجھے ازحد افسوس ہے۔ میں اس سے پہلے تمہارے ہاں نہ آسکی ماں کی طبیعت علیل تھی، خوبانی کیوں نہیں کھاتے، کھاؤ!"

میں نے مشکور نگاہوں سے اسے دیکھا، ایک خوبانی اُٹھائی اور منہ میں ڈال کر دل کو لعنت ملامت کرنے لگا۔ ارے میاں کچھ تو کہو، اگر شکایت کی جرأت نہیں تو اظہار محبت ہی سہی، ان تعریفی نگاہوں سے کیا ہوتا ہے کھل کر بات کرنا سیکھو، گونگے عاشق کو تو ادھیڑ عمر کی عورتیں بھی پسند نہیں کرتیں۔

"شاما تم ۔۔ ۔۔۔۔" میں نے کہنا شروع کیا۔

"اچھا، یہ ریشم کے کپڑے ہیں! شاما نے جلدی سے اخبار کو اپنی طرف سرکا کر کہا۔ کس قدر خوبصورت ہیں۔ تم نے کہاں سے پائے؟ اچھا یہ سادہ

ہے، یہ نر ہیں، کیا خوب، اور اب اِس نر مادہ کا آپس میں ایجاب قبول ہو
گیا، دیکھو تو یہ کیڑا ابڑا انسان ہے، پتہ نہیں اِس سے کیا کیا میٹھی باتیں
کرتا ہے سبھی مرد ایسے ہوتے ہیں۔
ہے نا یہ جوڑا تو الگ ہوا۔
" اب یہ باقی تین کہاں جائیں گے بیچارے کس طرح سسک رہے
ہیں دیکھو"

میں نے شاما کی طرف دیکھا، سونے کی مورت معلوم ہوتی تھی لب
تھوڑے سے کھلے تھے اور طلائے احمر کی طرح دمک رہے تھے۔

تم کس قدر خوبصورت ہو شاما" میں نے سینمائی انداز میں کہا "اِس
سے بھی زیادہ خوبصورت جتنا کہ تم اپنے آپ کو سمجھتی ہو۔ میری آنکھوں
اور تمہارے حُسن کے درمیان ایک زرد پردہ حائل ہے۔ مگر پھر بھی
تم مجھے بہت حسین نظر آتی ہو۔ اور اگر یہ پردہ سامنے سے ہٹ
جائے۔ تو پھر کیا یہ تابناک حُسن میری آنکھوں کو خیرہ نہ کر دے گی....
اور تمہاری آنکھیں کس قدر روشن ہیں، صاف اور پاکیزہ، نیلوفر کی
طرح کھُلی ہوئیں"

ماں دلیہ لیکر اندر آئیں، کہنے لگیں۔ بٹیا نیلوفر کی بابت کیا کہہ رہے
ہو؟"

" کچھ نہیں ماں۔ یہی۔۔۔۔ یہی۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔ سُنا ہے کہ نیلوفر
یرقان میں بہت مفید ہے۔

ہاں میں ابھی ابھی اِن سے یہ ذکر کر رہی تھی" شاما نے سر جھُکا کر کہا
بیٹا نہیں، نہیں موافق آئے نہ آئے"

"نہیں بیٹی، مجھے دیسی دوائیوں پر یقین نہیں۔ اور بعض حکیم تو . . . .
اماں شاما سے باتیں کرنے لگیں۔ میں چپ چاپ دلیہ کھانے لگا۔

شاما بہت حسین تھی۔ اس لئے چاہنے والے بھی بہت تھے۔ وہ بیاہی ہوئی تھی۔ اور یہاں میکے آئی ہوئی تھی۔ عاشقوں کے وافر ہونے کی یہ بھی ایک وجہ تھی۔ اس کا باپ مرچکا تھا۔ اور اس کی والدہ اس رنڈاپے میں بھی سہاگ کی شان اور جوانی کی آب کو قائم رکھے ہوئے تھی اس امر نے بھی شاما کے عاشقوں کی تعداد میں معتدبہ اضافہ کر دیا تھا۔ اور ان تمام امور کا شاما کو بخوبی احساس تھا۔ اس کے شریف اور بدعصمت ہونے کی یہ بھی ایک وجہ تھی۔

ہمارا قصبہ بہت چھوٹا ہے، اتنا کہ اس میں صرف پانچ حکیم، تین ڈاکٹر اور دو ویدپریکٹس کرتے ہیں۔ سوڈا واٹر کی صرف ایک دوکان ہے۔ ملائی کی برف بیچنے والا بھی ایک سے زیادہ نہیں، اور وہ ایک نوجوان ہے منچلا اور شاما کا چاہنے والا۔ شاما کی ماں اس سے ہر روز پاؤ آدھ پاؤ ملائی کی برف مفت کھا جاتی ہے۔ صرف دو درزی ہیں۔ ایک بچارہ ہے سیدھا سادھا آدمی، وہ قمیض کی سلائی دو آنے تک خوشی سے قبول کر لیتا ہے، دوسرا راولپنڈی پاس ہے اس نے تین سال تک راولپنڈی میں ایک مشہور و معروف انگریزی "ٹیلرنگ شاپ" میں کام سیکھا ہے۔ وہ سلائی صرف اتنی طلب کرتا ہے، جتنی کپڑے کی قیمت ہو۔ ہمارے قصبے کے نوجوان اس سے

بڑے شوق سے کپڑے سلواتے ہیں۔

ہمارے قصبے میں ایک مڈل سکول ہے۔ پہلے پرائمری تک ہی تعلیم دی جاتی تھی۔ مڈل کلاسیں اِس سال کھلی ہیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نووارد ہیں۔ خوبصورت خوش طبع جوان ہیں۔ سکول کو اپنے کالج کا بدل بنانا چاہتے ہیں۔ گاتے خوب ہیں دُور سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا کوئی گراموفون بج رہا ہے۔ پیارہ قوال "من تو شدم تو من شدی" انہیں بہت مرغوب ہے، شاما کے گھر سے گزرتے ہوئے انہیں اکثر گنگناتے بلکہ صاف گاتے ہوئے سُنا گیا ہے، شاما بھی کبھی دریچے میں بیٹھ کر سُن لیتی ہے۔ اِس کے چہرے پر اُس وقت ایک عجیب مسکراہٹ ہوتی ہے۔ جوش رقابت میں ہمیں اُسے محبت سے تعبیر کرتا ہوں۔

ہمارا قصبہ نائب تحصیلدار صاحب کا صدر مقام ہے، وہ مجسٹریٹ بھی ہیں۔ اور طبیب بھی۔ اُن کی غیر معمولی ہردلعزیزی کا بڑا باعث یہی ہے۔ فارسی اچھی خاصی جانتے ہیں اور ادیب بھی ہیں۔ شاما کو خالص فنی نکتہ نگاہ سے دیکھنے اور پرکھنے کے عادی ہیں۔ اور اس پر اس انداز سے تنقید کرتے ہیں۔ گویا شاما، شاما نہیں، زندہ عورت نہیں بلکہ لدگیو کا ایک مرمریں مجسمہ ہے یا باٹلی سیلی کی پُرکیف تصویر۔

ہمارے قصبہ میں باوا تھمن گر کا استھان بہت مشہور ہے عقیدت مند زیادہ تر جو اکثر طبقہ اناث سے تعلق رکھتی ہے۔ انہیں صرف "باوا جی" کہہ کر پکارتی ہیں، باوا جی کی جوانی ڈھل چکی ہے۔ مگر بہ باتا میں جوانوں سے آگے قدم دھرتے ہیں؛ فنا ہونے سے پہلے کھیلتی

ہے ۔ موتح پانی پر، چرس کا دم لگاتے ہیں، شراب پیتے ہیں اُور شاما سے افلاطونی محبت رکھتے ہیں، قد لانبا، جسم اکہرا اُور رنگ بگلے کی سپید ہے ۔

سادُن

ساوُن برسات کا مہینہ ہے ۔ ساون میں جھولے پڑتے ہیں، شاعر اُور ندی نالے طغیانی پر آجاتے ہیں ۔ دل میں اُمنگیں اُٹھتی ہیں ۔ شاید خون کچا ہوتا ہے ۔ جوش مارتا ہے ۔ میں نے بھی اپنی کوٹھڑی چھوڑ دی اُور باہر باغ میں آرہا، سرول کے ایک گھنے چھتنارے کے نیچے میرا بستر تھا ۔ اُور اِس کے نزدیک ہی ایک چنار پر میری چھوٹی بہن نے جھولا ڈلوایا تھا ۔ قصبہ بھر کی لڑکیاں دوشیزائیں اُور نویلی بہوئیں ہمارے ہاں جھولا جھولنے آتی تھیں ۔ بڑا دل کشی منظر ہوتا تھا ۔ جب شاما پینگ بڑھاتی ۔ تو میرا دل بلیوں اچھلنے لگتا ۔ اُور جب وہ پینگ بڑھاتے بڑھاتے دو ۔ اوپر چنار کی ٹہنیوں کے سبز سبز پتوں میں ایک لمحے کے لئے گم ہو جاتی ۔ تو میرا دل اچک کر گلے میں آ رہتا، کہیں وہ گر نہ پڑے ۔

ایک دن جب شاما جھولا جھول رہی تھی اُور میرا نوکر رالی میرے پاؤں داب رہا تھا، میں نے اِس سے پوچھا، رالی اگر وہ گر پڑے تو پھر کیا ہو؟

رالی بولا کون بابو جی "

"شاما"

رالی بچارا حیران نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا ۔ اُسے میری

بات سمجھ میں نہ آئی ۔ اُسے کیا پتہ تھا کہ غربت کیا چیز ہوتی ہے ۔
رالی بچارا سیدھا سادھا نوکر ہے ۔ کبھی کبھی ہکلا کر بات کرتا ہے
باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم ہے ۔ کیونکہ اس کی سوتیلی ماں نے اسے
گھر سے نکال دیا ہے اور بڑے بھائی کے پیار اور ماں باپ کے لاڈ اور
چاؤ نے عالم شباب ہی میں اس کے بال کھچڑی کر دیئے ہیں ۔
" رالی بین نے اُسے ایک لمبے وقفے کے بعد کہا " تم میرے بات نہیں
سمجھتے " اتنے میں شاما کی ماں دوڑتی ہوئی آئی کہنے لگی ، بابوجی ، ذرا رالی کو
اجازت نہ دینا ، پن چکی سے پیسا کرے آئے ، بڑی مہربانی ہوگی (آسمان کی
طرف نگاہ اٹھا کر) آج ضرور بارش ہوگی ۔ اور اگر رالی ابھی ابھی آٹا نہ
لے آیا ۔ تو پھر ندی زوروں پر ہو جائے گی ، دیکھئے بادل پہاڑوں پر
کیسے چھائے ہوئے ہیں ۔
رالی بولا " میں ابھی جاتا ہوں "
میں نے کہا " میری طرف سے اجازت ہے " رالی یہ سنتے ہی اُٹھ کھڑا
ہوا ۔
رالی بچارا بہت سیدھا سادھا ہے ۔ میں نے آسمان کی طرف نگاہ اُٹھائی
چاروں طرف بادل چھا رہے تھے ۔ اور مشرق کی طرف تو کالا دھاری کی
چوٹیاں کالی گھٹاؤں میں چھپی ہوئی تھیں ۔ میں نے دل میں سوچا آج ندی
میں خوب طغیانی آئے گی ۔ پہاڑی نالہ کمزور آدمی کے غصے کی طرح ہے
جلد چڑھتا ہے ۔ اور جلد ہی اُتر جاتا ہے ، ساون کے دنوں میں ندی کئی
جانیں لے لیتی ہے ۔ نالہ ایک دم ٹھاٹھیں مارتا ہوا آتا ہے اور کناروں
سے اُچھل کر میلوں اطراف میں پھیل جاتا ہے ، گاؤں کے گاؤں تباہ و برباد

ہو جاتے ہیں۔ ڈھور ڈنگر اور اناج اور مال کے نقصان کا کچھ اندازہ نہیں۔

اماں میرے قریب آ کر کہنے لگیں "اندر چلو، آج بارش ہو گی، گھٹا تلی کھڑی ہے۔

رالی کہاں ہے؟"

شاما کی ماں نے بن چکی سے آٹا لانے کو کہا تھا۔ ادھر ہی گیا ہو گا، چلو اندر چلتا ہوں۔ لڑکیوں کے جھولا جھولتے بارش شروع ہو گئی۔ پل میں جل تھل ہو گیا۔ ندی کی پُر شور روانی میری خوابگاہ کے اندر بھی سنائی دے رہی تھی۔

رات کے دس بج گئے۔ رالی نہ آیا۔ اماں، اسی فکر میں کھوئی ہوئی میرے پاس بیٹھی رہیں۔

"کمبخت کو اس وقت جانے کی کیا ضرورت تھی انکار کر دیتا۔" اماں نے کہا۔

"میں نے ہی اجازت دیدی تھی۔" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

"تم بھی نادان ہو۔ وہ بھلا اس موسلا دھار بارش میں کیسے آئے گا ذرا ندی کا شور تو سنو، ندی ٹھاٹھیں مار رہی ہے اور وہ اس وقت تک کیوں نہیں آیا، بن چکی بھی تو دور نہیں ہے۔ یہی چار میل کے قریب ہو گی اُسے اس وقت تک آ جانا چاہئے تھا۔ کہیں اس پار ہی نہ رہ گیا ہو۔"

"اور اماں" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "اگر اس نے ندی کو عبور کرنے کی کوشش کی ہو۔ یوں تو اچھا خاصا تیراک۔۔۔۔۔۔"

"چپ بیٹا! یوں نہیں کہا کرتے، رام سب کا بھلا کرتے ہیں۔"

کے بارہ بج گئے۔ مگر مجھے نیند نہ آئی۔ شمع کی تھرتھراتی ہوئی لو میں میں نے دیکھا کہ اماں وہیں بیٹھے بیٹھے سو گئی ہیں۔ اتنے میں آنگن میں آہٹ سی ہوئی کسی نے دیوار کے ساتھ اپنا سونٹا ٹیک دیا۔ اور لمبی سانس لی۔

"میں نے کہا" رامی ہے؟"

"جی ہاں"

"آٹا لے آئے"

"دے آیا بابو جی، وہاں اُن کے گھر تو سب سوئے پڑے تھے۔ وہ چھوکو جگایا اور اُس کے حوالے کر کے ابھی آرہا ہوں"

"کمبخت میں پوچھتا ہوں تم آٹا کیسے لے آئے؟"

"کھال میں بابو جی، بالکل نہیں بھیگنے دیا۔ ندی بڑے زوروں پر تھی، پرمیشر نے ہی جان سلامت رکھی"

"بیوقوف تمہیں آنے کی اتنی کیا جلدی تھی، ندی کے پار ہی رہ جاتے"

"میں نے سوچا شاما بھوکی رہے گی ......"

جواب سُن کر میں بھونچکا رہ گیا، یہ بینگن کے پودے میں انگور کے خوشے کیسے، تلخ لہجے میں میں نے اُس سے پوچھا" اور اگر تم ندی میں غرق ہو جاتے تو ......"

رامی تھوڑی دیر چپ رہا۔ پھر ہکلانے لگا" میرا.... رامی کیا ہے بابو جی، یہ زندگی.... ک.... ک.... کسی کے کام آجاتی، میں اپنے آپ کو بھاگوان سمجھتا"

"کمبخت، مجنوں بھی کوئی تمہاری ہی طرح کا گنوار ہوگا"

"کیا کہا بابو جی"

"کچھ نہیں جاؤ، سو رہو!"

اب شمع زرد پڑ چکی تھی، زرد اور بالکل ساکن، صرف ایک پروانہ اُس کے گرد گھوم رہا تھا، میں غنودگی سے لبریز نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ پروانہ ...... شمع ...... رانی .... پروانہ ...... رانی ...... شمع ...... رانی ...... شاما ...... شمع ......

"باوا لچھمن گر کا "استھان" ندی کے کنارے شمشان بھومی کے قریب واقع ہے۔ اِس میں ایک چھوٹا سا مندر ہے اور ایک مختصر سا باغیچہ اور اِس کے ساتھ کپڑے دھونے کا گھاٹ، باوا جی اور اُن کا چیلا سومناتھ وہیں دیوی کے قدموں میں آسن جماتے ہیں۔ اور رات کو بھی وہیں پڑ کر سو رہتے ہیں۔ ندی میں ہر سال طغیانی آتی ہے، مگر مندر ہمیشہ محفوظ و مامون رہتا ہے۔ پچھلے سال تو گھاٹ بھی بہ گیا تھا۔ مگر مندر جوں کا توں کھڑا رہا۔ یہ سب باوا جی کی دُعا کا اثر ہے۔ اور اُن کے فوق الفطرت ہونے کا ثبوت، شاما کی ماں دودھوا باوا جی کو ہر روز پرنام کرنے جاتی ہے۔ اور شاما بھی کبھی کبھار اُس کے ساتھ جایا کرتی ہے۔ میں نے پہلے پہل اُسے باوا جی کے باغیچے میں ہی دیکھا تھا۔ اُس نے جوہی کے پھولوں کا ایک گچھا اپنے بالوں میں لگا رکھا تھا۔ اور دوپٹہ میں پھول چن چن کر رکھ رہی تھی۔ آہ جوہی کے پھول۔

کتنی مدت ہو گئی۔ اُس اولین ملاقات کو، مگر آج پھر وہ پہلی نگاہیں اور جوہی کے پھول مجھے رہ رہ کر یاد آ رہے تھے۔ ہم گھڑی کی سوئیوں کو اُلٹ پلٹ کر سکتے ہیں، مگر زمانے کی سوئی کو اُلٹا پھیر دینے کی کس میں ہمت ہے۔ کاش وہ پہلی نگاہیں مجھے واپس مل جائیں۔ کاش میں اُنہیں پھر ایک بار دیکھ

لتیا، وہ نگاہیں جنہوں نے میرے سینے میں اُمنگوں کا طوفان برپا کر دیا تھا۔ جنہوں نے محبت
کی سوئی ہوئی ندی کو اپنے نازک ہنواروں سے متلاطم کر دیا تھا۔ مگر آج وہ حقیقت محض
ایک خواب ہے، شفق کی طرح رنگین قوسِ قزح کی طرح دُور ....
رالی میرے پاؤں داب رہا تھا۔ میں نے اُسے آہستہ سے کہا "رالی
شہر سے جوہی کے پھول لاؤ گے ؟"
رالی بولا "بابوجی بارش ہو رہی ہے" پھر یہ کہکر خود ہی اُٹھ کھڑا ہوا "
اچھا جاتا ہوں "
رالی اُسی موسلا دھار بارش میں اُٹھ کر چلا گیا۔ آج اُس کی نگاہ اولین
کی یاد نے دل کی دبی ہوئی امنگوں میں ایک ہیجانی کیفیت سی پیدا کر دی تھی۔
میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنی خیالی دُنیا میں گم ہو گیا۔ اِس دُنیا کو مجھ سے
کوئی چھین نہیں سکتا۔ اِس خیال سے مجھے ایک گونہ تسلی ہوتی ہے کہ یہ
دُنیا میری ہے اور اِس جسدِ خاکی کے آخری سانس، زندگی کے آخری لمحے
اور دل کی آخری دھڑکن تک یہ دُنیا میری ہو گی، شاید اب یہ دُنیا ہی میرا
سرمایہ حیات ہے۔ اِس دُنیا میں پہنچ کر مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں ایک
ناؤ بن گیا ہوں ایک ناؤ جو چاروں طرف لہروں سے گھری ہوئی ہے۔ لہریں
کھیلتی ہیں، مسکراتی ہیں۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی ارغوانی کرنوں کو تھک
تھک کر پیار کرتی ہیں، یکایک میں اپنے بادبان پھیلا دیتا ہوں۔ اور لہریں
اپنے شانوں پر لئے ہوئے مجھے دُور، دُور بہائے جاتی ہیں۔ پتہ نہیں
کس طرف ؟ بجانے کیوں ؟ مجھے صرف اک خاموش موسیقی اور اک جانفزا
سرور کا احساس ہوتا ہے، کیف آور اور شیریں۔
پتہ نہیں میں کتنا عرصہ اِسی خیالی دُنیا میں گم رہا یا کتنا عرصہ اور اسی

خیالی دُنیا میں گم رہتا - اگر اماں میرا شانہ جھنجھوڑ کر جگا نہ دیتیں "بیٹیا، اُٹھو تو سہی، وہ دیکھو رالی ....

میں نے آہستہ سے کہا "کیا بات ہے ماں، رالی پھول لے آیا ؟"

"اچھا تو کیا تم نے اُسے مندر بھیج دیا تھا ؟" اماں نے کہا "آہ بچارا رالی، اس کا بازو ٹوٹ گیا ہے۔ اور اس کے سر پر کئی چوٹیں آئی ہیں، یہ آمدے میں پڑا ہے"

میں جلدی سے اُٹھ کر برآمدے میں گیا۔ رالی آنکھیں بند کئے چارپائی پر پڑا آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ سر پر اور دائیں بازو پر پٹیاں بندھی تھیں میں نے پوچھا "بیوقوف، کیا مندر میں باوا جی سے لڑ پڑے، اگر وہ پھول نہ دیتے تھے تو واپس چلے آتے جھگڑا کرنے کی کیا ضرورت تھی، سوہنا تھ نے بھی پٹیا ہوگا تمہیں، جیسا گورو ویسا چیلا"

"وہ مندر کہاں رہا بٹیا، یہ جو تین دن سے لگاتار بارش ہو رہی تھی، اس کمبخت جھڑی کو کچھ لیکر ہی ٹلنا تھا۔ آج ندی میں اس قدر طغیانی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ ذرا شور تو سُنو، اور جب رالی مندر کی طرف پھول لینے گیا تو مندر کے چاروں طرف پانی چڑھ رہا تھا۔ اور گھاٹ بہ رہا تھا۔

تو .... میں نے تو اُسے یوں ہی بھیج دیا تھا۔ اگر پانی چڑھ رہا تھا تو نہ جاتا، ایسی بھی ...... میں نے فقرہ نا تمام چھوڑ دیا۔

"کیسے نہ جاتا بٹیا، وہاں شاما ......"

"کیا کہا، شاما ؟"

اماں میری بات ان سُنی کر کے بولیں "اور دیکھو یہ باوا اور اس کا چیلا ـــ دونوں کتنے کمینے نکلے ان کو اتنا بھی نہ خیال آیا کہ ....

"مگر شاما کیا؟" میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہ پوچھو بٹیا۔" اماں جلدی سے بولیں "کہ شاما بھی وہاں گئی ہوئی تھی۔ اور دیوی جی کو پرنام کر کے باغیچہ میں جوہی کے پھول چن رہی تھی کہ بارش نے آگھیرا۔ وہیں مندر میں ٹھہر گئی۔ سوچا ہوگا۔ کہ بارش تھمے تو جاؤں، آن کی آن میں جل تھل ہو گیا، مندر کے چاروں طرف پانی لہریں مارنے لگا۔ اور جب نیا گھاٹ بھی بہنے لگا اور ندی کا رُخ مندر کی طرف مڑا۔ تو باوا جی بڑے گھبرائے، چیلے سمیت بھاگ کھڑے ہوئے۔

"اور شاما کو وہیں چھوڑ دیا؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"کچھ نہ پوچھو، جان تو سب کو پیاری ہوتی ہے، جب رانی وہاں پہنچا تو پانی نے مندر کو چاروں طرف اچھی طرح سے گھیر لیا تھا۔ شاما سیڑھیوں پر کھڑی چیخیں مار رہی تھی۔ اور باوا جی اور اُن کا چیلا تیرتے ہوئے خشکی کی طرف آ رہے تھے۔"

"کمینے!" میں نے تیز تیز لہجے میں کہا۔

اتنے میں کسی نے باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا، اماں اندر چلی گئیں، نانا جی تحصیلدار صاحب تھے۔ برآمدے میں آ کر رانی کے سرہانے بیٹھ کے کہنے لگے: "آپ کے نوکر نے آج بڑی جوانمردی دکھائی۔ مندر کی گرتی ہوئی دیواروں اور ٹھاٹھیں مارتے ہوئے پانی کے ریلوں سے شاما کو بچا کر لے آیا۔ چوٹیں تو بہت لگی ہیں بچارے کو۔ میں نے ڈاکٹر سے وہیں پٹی وغیرہ کا انتظام کر دیا تھا۔ آج شام کو ڈاکٹر پھر آئیگا۔ . . . . . رانی بٹیا تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔"

اتنا کہہ کر تحصیلدار صاحب چپ ہو گئے اور رانی کی طرف دیکھنے لگے۔

رانی خاموش لیٹا ہوا تھا۔ میں نے اس کی نبض دیکھی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"کیوں رو تے ہو رانی؟" میں نے پوچھا۔

رانی نے دھیمے لہجہ میں جواب دیا "بابو جی سر میں بہت درد ہے"

تحصیلدار صاحب چارپائی سے اُٹھ کر بولے۔ اچھا تو میں چلتا ہوں اور ڈاکٹر کو ابھی آپ کے ہاں بھیجتا ہوں، چوٹیں تو معمولی ہیں۔ میرے خیال میں ایک دو دن میں اچھا ہو جائیگا۔ فکر نہ کریں۔ شاما کا خاوند سُنا ہے کل یہاں پہنچے گا۔"

وہ چلے گئے، میں چپ چاپ رانی کے پاس بیٹھا رہا۔ شاما کا خاوند کل یہاں پہنچے گا۔

.... کل ..... فکر نہ کریں ..... چوٹیں معمولی ہیں ...... پھوٹا .....

کاش تحصیلدار صاحب کو پتہ ہوتا۔ کہ چوٹیں معمولی نہیں ہوا کرتی ......

اماں رانی کے لئے گرم دودھ لے آئیں! میں چمچہ سے اُسے پلانے لگا۔ اماں کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔

اِس واقعے کے پانچ روز بعد شاما اپنے خاوند کے ہمراہ چکوال چلی گئی جانے سے قبل وہ مجھے ملنے کے لئے آئی۔

"میں آج جا رہی ہوں بھیا۔"

اِس کا چہرہ زرد تھا۔ اور لب انار کی کلی کی طرح سُرخ تھے۔

میں نے خاموش نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ اور چپ ہو رہا۔ ماں نے ہاتھ پھیلا کر اُسے دعا دی "پرمیشر تمہارا سہاگ ہمیشہ قائم رکھے"

رانی کدھر ہے بھیا، میں اُسے ملے بغیر نہ جاؤں گی

ماں نے جواب دیا۔" رانی چشمے سے پانی بھرنے گیا ہے۔ اب آتا ہی

ہوگا۔

گھنٹہ یوں گھنٹہ گزر گیا، مگر رانی نہ آیا۔

میں نے نہایت نرم لہجے میں آہستہ سے کہا۔" شاید وہ نہ آئیگا شاما

جیسے اُس نے میری بات سمجھ لی ہو۔ وہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی، آہستہ سے

بولی۔" تم اچھے ہو جاؤگے بھیا، پھر اُس نے سر جھکا کر ماں کو پرنام کیا۔

اور وہ چلی گئی۔ چپ چاپ، خاموش سر جھکائے ہوئے مجرم کی طرح۔

کائنات کا ہر ذرہ بے مصرف ہے اور انسان کی ہر کوشش بے سود،

یہ انسان کتنا حقیر ہے اور یہ دُنیا اِس سے بھی حقیر تر۔ یہ عقدہ لاینحل

کیا ہے؟ اور کس لئے؟ اور پھر اگر تمام زندگی کو یوں مٹھی میں بند کر کے

چُرمُر کر دیا جائے، اِس طرح کہ اِس کے ریزے ریزے ہو کر بکھر جائیں

اور کوئی اِن کی سوانگ بھی نہ پا سکے، تو پھر.... تو پھر کیا ہو......

کس لئے؟ .... کیونکہ

دل میں ہزاروں خیال تھے۔

بے سود، سب بے سود،

... ے ہوئے

بہت دیر کے بعد رانی آیا۔ پانی کا گھڑا ...

چہرا اُترا ہوا تھا۔ اور ہونٹ نیلے۔ ...

پاؤں دابنے بیٹھا۔ تو میں اُس سے ...

رہا۔

" ماں مجھے دیر ہو گئی۔ بابو جی، ...

کچھ دیر ہم دونوں خاموش رہے۔ پھر رانی بولا "اس دن آپ نے جوہی کے پھول مانگے تھے، آپ یہ گچھا لے سکتے ہیں، یہ کہہ کر اس نے جیب سے پھولوں کا ایک گچھا نکالا اور میرے ہاتھ میں دے دیا۔ باسی پھول تھے اور پتیاں زرد، مگر ان میں خوشبو تھی۔

مجھے تحصیلدار صاحب کی بات یاد آگئی۔ میں نے کہا۔ رانی اسے تم رکھ لو۔ یہ لو اسے تمہیں اپنے پاس رکھو

نہیں بابوجی میں اسے نہیں لے سکتا۔"

کیوں؟

رانی چپ ہو رہا۔

میں نے ایک پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ رانی مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ تم اتنے جذباتی اور شاعر مزاج ہو"

رانی چپ بیٹھا رہا۔ بے جان، بے حس و حرکت، مٹی کی مورت۔ پھر سر جھکا کر آہستہ سے میرے پاؤں دابنے لگا۔ گرم آنسوؤں کے ایک دو قطرے میرے پاؤں پر گر پڑے۔

زندگی کس قدر عجیب ہے۔

[illegible] پچھ [illegible] ... سو سنا کہ ... رانی ... بابوجی ... [illegible]

جانے [illegible] اس دن مجھے ملنے [illegible]

......

"میں آج جا رہی ہوں بھیا [illegible]

اس کا چہرہ زرد تھا۔ اور [illegible]

میں نے خاموش نگاہوں سے [illegible]

ہاتھ پھیلا کر اسے دعا دی" پبلشر [illegible]

(منوہر کاتب لدھیانہ)
[illegible]
[illegible]

حقوقِ اشاعت بحقِ مصنف محفوظ ہیں

قیمت

دو روپیہ ۲





نسیم بکڈپو۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ

ٹیلیفون ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۲۲۵۵۹

ناشر: سید مسعود حسن رضوی ادیب جنوری ۱۹۶۷ء پرنٹر: الواعظ

ایرانیوں کا مقدّس ڈراما

(تعزیہ یا شبیہ گردانی)

ترقی یافتہ ملکوں کے عینی شاہدوں کے تاثرات

سید مسعود حسن رضوی ادیب